اکتوبر، نومبر
1969

ماہنامہ
حیات نو

جلد ۲ شمارہ ۱۰، ۱۱
ذی قعدہ و ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ
اکتوبر و نومبر ۱۹۶۹ء

مجلس ادارت

انصار احمد فلاحی	مدیر مسئول	بلریاگنج
نسیم احمد غازی فلاحی		دہلی
رضوان احمد فلاحی		مدینہ منورہ
جاوید اشرف فلاحی		جامعۃ الفلاح
عبید اللہ فہد		" "

اس شمارے کی قیمت	چار روپے	۴/۰۰
سالانہ زر تعاون	پندرہ روپے	۱۵/۰۰
ششماہی	آٹھ روپے	۸/۰۰

○

اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کا سالانہ زر تعاون ختم ہو چکا ہے براہ کرم سالانہ زر تعاون مبلغ پندرہ روپے ۱۵/۰۰ ارسال فرما کر مشکور فرمائیں۔

منیجر ادارہ۔

مطبوعہ نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد

1969

حیاتِ نو کے نقوش

۱۔ حرفِ گفتنی :۔

ہم سب اپنے باپ سے محروم ہو گئے۔ (اداریہ)

۲۔ ہدایات ربانی :۔

فریضۂ اقامت دین شخصیتوں کی موت و حیات سے بے نیاز ہے۔ (ابو اسامہ محمد فلاحی)

۳۔ اہم انٹرویوز :۔

بیگم مودودی سے ایک اہم ملاقات (رفعت)

نوابزادہ نصر اللہ خاں سے انٹرویو (نصر اللہ غازی)

مولانا عاصم نعمانی کا انٹرویو (طارق نیازی)

مولانا کے دیرینہ خدمتگار محمد حنیف سے ملاقات "

۴۔ تعارف :۔

مولانا مودودی اپنا تعارف خود کراتے ہیں۔

قائد تحریک اسلامی کی وفات پر ریڈیو پاکستان کا خصوصی فیچر۔

سوگوار ماں اور غمزدہ بیٹے کا ٹیلی فون پر مکالمہ۔

لوگ غصہ دلاتے تھے مگر مولانا کو غصہ نہ آتا تھا (ارشد فلاحی)

حیات مودودی قدم بقدم (ماسٹر جنید احمد طریا گنج)

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں (سکریٹری انجمن)

مولانا مودودی علماء و اکابرین کی نظر میں (جاوید احسن مجاہد طلبۂ قدیم)

۵۔ تحریک کہانی :۔

تحریک اسلامی اور مولانا مودودی (مولانا نظام الدین اصلاحی)

آسمان اصلاح و تجدید کے دو ستارے (عبید اللہ فہد)

۶۔ ارزاں تحریریں :۔

نوجوان فرط غم سے بیہوش ہو گئے (نسیم احمد فلاحی)

اس صدی کا رجل عظیم اٹھ گیا (نور محمد فلاحی)

آنسوؤں سے استقبال، آنسوؤں سے خطاب تھا (شکریہ دوبالہ)

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا (محمد عمران فلاحی)

۷۔ اخبارات کا خراج عقیدت :۔

آہ یہ شخص ! ۔ روزنامہ جسارت لاہور

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ روزنامہ جنگ کراچی

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ بھی گئے روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی

مودودی صاحب کا انتقال آزاد ہند کلکتہ

۸۔ شعراء کا نذرانہ عقیدت :۔

شورش کاشمیری منصف اعظمی ماہر القادری

اختر ہوشیار پوری انوار عزمی ارشد فارانی

کوثر اعظمی۔

۹۔ دل کی پکار :۔

شبنم سبحانی مائل خیر آبادی محمد امین اثری

سید قاسم رسول الیاس ڈاکٹر نور العین عثمانی شفیق

عالم فلاحی محمد خالد فلاحی مشہور عالم فلاحی۔

۱۰۔ دیا ہے جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب :۔

مختلف تعزیتی پیغامات و قرار دادیں۔

۱۱۔ عالم اسلام کی ممتاز شخصیتوں نے خراجِ عقیدت پیش کیا :۔

(مولانا امین احسن اصلاحی)

شاہ خالد، آیت اللہ خمینی، مولانا اسعد مدنی، مولانا محمد یوسف اور متعدد رہنما۔

[ہمارے خصوصی نمائندے عمران احمد فلاحی، نور محمد فلاحی اور نسیم احمد فلاحی نماز جنازہ میں شرکت کے لئے پاکستان گئے اور اپنے ساتھ سمیٹ سکیں، آنسوؤں اور بیتاب جذبات سمیٹ کر لائے جو ان صفحات کی نذر ہے۔]

دھڑکنیں

ہم سب اپنے باپ سے محروم ہو گئے ہیں

اس صدی کی متعدد شخصیتیں ایسی ہیں جنہوں نے نوجوانوں کو متاثر کیا ہے۔ لیکن اقبالؒ اور مرشد مودودیؒ کی گہری فکری چھاپ کے مقابلے میں دوسروں کی چھاپ مٹتی نظر آتی ہے۔ انہوں نے دلوں کو جو ولولۂ تازہ دماغوں میں انقلابی برق رو اور ذہنوں کو جو حوصلے بے تاب عطا کیا ہے یہ اسی کا فیض ہے کہ آج اسلام محض دھرم کی بجائے مکمل نظام کی روپ میں سامنے آگیا ہے۔ ایک انقلابی تحریک کی شکل میں دنیا کے ہر گوشے میں مصروف عمل ہے جس نے ایران کے دو ہزار سالہ مستبد جابر حکومت کا تختہ پلٹ کر امن و انصاف کی حکومت قائم کی جس نے افغانی مجاہدین کو سرخ بیڑیوں کو چت کر دینے کا عزم عظیم کیا اور جس نے پاکستان میں لادینی عناصر کی لٹیا ڈبو دی ہے۔ ہندوستان میں جس کے شیدائی ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کیلئے ناگپور میں اکٹھا ہو رہے ہیں۔

مولانا مودودیؒ پہلے فرد ہیں جنہوں نے نوجوانوں کو انقلابی تحریک کی راہ پر لگایا۔ انہیں مقصد سے سچا عشق اور اپنی خودی کا عرفان اور صحیح منزل کی آگہی دی۔ انہیں جہان فانی کی حقیقتوں سے خبردار کر کے جہان نو تعمیر کرنے کیلئے تیار کیا یہی وجہ ہے کہ آج ہم نوجوان مولانا کے انتقال سے سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ آج ہم ہند و پاک ہو یا عرب و چین، صحرائے افریقہ ہو یا سبزہ زاران یورپ، جہاں بھی متحرک ہیں اور اسلامی نظام کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں سب مرشدی مودودیؒ کا فیضان نظر ہے۔

مرشدی مودودی کیا تھے؟ بس یوں سمجھو انقلاب کی آواز تھے انقلاب جو کاخ امراء کے در و دیوار کو ہلا کر مزدوروں کی حکومت قائم نہیں کرنا چاہتا تھا اور جسے مغربی استعماریت کا باج گزار بھی بننا منظور نہ تھا۔ سرخ و سپید سے آزاد انقلاب دائیں، بائیں بازو سے ناوابستہ انقلاب۔ امیروں غریبوں کو ایک صف میں کھڑا کرنے والا انقلاب۔ انسانیت کو ایک خدا کی بندگی پر آمادہ کر کے دوسری تمام بندگیوں سے نجات دلانے والا انقلاب ـــــ اور یہ آواز اب انتہائے عالم میں گونج چکی ہے۔ جنگل کے پتے پتے پر، در و دیوار کی ہر ہر اینٹ

بے دینوں کے دلوں اور نوجوانوں کے دماغوں پر اپنا نقش ثبت کر چکی ہے۔ اب یہ آواز دبائے نہیں دب سکتی۔ وقت کے جابر حکمرانوں نے اس آواز کو دبانا چاہا، وہ خود دب گئے لیکن یہ ابھرتی چلی گئی۔ اور آج اس کی بازگشت و اشگاف سنائی دے رہی ہے۔

سیدی مودودی ؒ علم و عمل میں یہاں کی کا چراغ۔ بصیرت و بصارت اور عقل و دانشوری میں منارہ نور کا نام ہے۔ موقف کی راستی، فکر کی صحت، عمل میں اخلاص و للہیت بے پناہ تبحر علمی اور حضرت علامہ کے بقول فقیری کی شان میں امیری کو مولانا مودودی ؒ کہتے ہیں۔ تاریخ میں ایک سے ایک بڑھ کر نابغہ روزگار اور عبقری زمانہ پیدا ہوتے بڑے بڑے منصب فن کار، سیاست دان، محقق، ادبی و لیڈر اپنی جلوہ طرازی دکھا گئے۔ مگر ان سب کی کوششیں اور کارنامے کسی ایک میدان اور کسی ایک فن تک محدود رہے۔ ہندوستان کی جدید ترین تاریخ کو علامہ فراہی ؒ جیسا مفسر و محقق، ابوالکلام جیسا خوش بیان خطیب اور آگ لگانے والا قلمکار، محمد علی جوہر جیسا بیباک مقرر، علامہ شبلی جیسا محقق، ان سب کی سیرتیں پڑھو سب کی کوششیں اور سرگرمیاں کسی ایک خاص میدان تک محدود رہیں۔ مگر حیرت ہوتی ہے سیدی مودودی ؒ کی زندگی پر کہ ایک طرف بہترین افکار و نظریات پر مشتمل ضخیم لٹریچر تیار کیا دوسری طرف لاکھوں نوجوانوں کی سیرت سازی کا سب سے مشکل کام کر دکھایا تیسری طرف تحریک اسلامی کی قیادت کی دن رات بھر دوروں کا پروگرام تقریریں، ملاقاتیں سب کچھ انجام دیا اور چوتھی طرف ملک کے دینی حلقے سے کبھی کبھی نہیں بلکہ اپنوں اور علماء کی طرف سے بھی تیز و تند حملوں کو برداشت کیا۔

مرشدی مودودی ؒ نوجوانوں کے باپ اور شفیق تھے۔ آج ہمارا باپ ہم سے جدا کر لئے گئے

جا رہا ہے۔ ہم نوجوانوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ

ہمارا وطن بھارت تہذیبی جارحیت کا شکار رہیگا؟
یہ غیروں کے دریدہ دست سوال دراز کرتا رہے گا؟
یہاں اخلاقی اقدار پامال ہوتے رہیں گے؟
نوجوانوں کا استحصال ہوتا رہے گا؟

نہیں

ہم مولانا مودودی ؒ کے عقیدت مند اسلام پسند نوجوان اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ملک کو تباہی سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ نوجوانوں کو بروقت آگاہ کریں گے اور ملک کی تعمیر میں ان کے کردار سے روشناس کرائیں گے۔

دوستو! آؤ ہم بہت رو چکے۔ اب اپنے آنسو خشک کریں۔ ہم اپنی رقتوں، سسکیوں اور آہوں کو ترنم میں تبدیل کر لیں۔ فضا کی سوگواری ختم کریں۔ اور اب ہم سب پوری یکسوئی اور کامل توجہ کے ساتھ اس مشن کی تکمیل میں لگ جائیں جو ہم سب کے مرشد، ہم سب کے شفیق باپ اور ہم سب کے رہبر نے چھوڑا ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ

"تم یاد کرو گی یا میں"

"امریکہ روانگی سے قبل ایک روز کھانے پر ہماری والدہ نے ایک سالن آگے کرتے ہوئے کہا "میاں صاحب! آپ بھی کھالیں کیا یاد کریں گے۔" مولانا نے فوراً جواب دیا "تم یاد کرو گی یا میں یاد کروں گا۔" والد مرحوم کی ظرافت بھی تیز ہو گئی تھی۔"

حسین فاروق مودودی

انصار احمد فلاحی

ہدایاتِ ربانی

فریضۂ اقامتِ دین شخصیتوں کی موت و حیات سے بے نیاز ہے

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا ۗ وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ○ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُؤَجَّلًا ۗ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ ○ وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ○ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ○ فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ○

(آل عمران ۱۴۴ تا ۱۴۸)

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے اور رسول بھی گذر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا البتہ جو اللہ کے شکر گذار بندے بن کر رہیں گے انھیں وہ اس کی جزا دیگا۔ کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔ جو شخص ثواب دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں دے دیں گے اور جو ثواب آخرت کے ارادے سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا اور شکر کرنے والوں کو ہم ان کی جزا ضرور عطا کریں گے۔ اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گذر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے، انھوں نے کمزوری نہیں دکھائی، وہ باطل کے آگے سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی "اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگذر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف کر دے، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔" آخر کار اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثواب آخرت بھی عطا کیا، اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں۔

تشریح: یہ آیتیں احد سے متعلق سلسلہ کلام سے تعلق رکھتی ہیں۔ احد کی لڑائی کے بارے میں یہ بات جان لینی چاہیے کہ شروع میں مسلمانوں نے قریشی دشمنانِ دین کو مولی گاجر کی طرح کاٹنا شروع کیا۔ اگر یہ سلسلہ قائم رہتا تو قریش

کر بیٹھی تو شاید تباہ ہو جاتی یعنی قرآن کی تصریح کے مطابق باہمی نزاع و فرقہ بندی کے نتیجے میں خدا نے اپنی مدد کا ہاتھ کھینچ لیا اور فتح شکست میں تبدیل ہونے لگی اس غیر متوقع صورت حال سے مسلمان سراسیمہ ہو گئے اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز سے پکارا "اے اللہ کے بندو! کہاں بھاگے جا رہے ہو میں اللہ کا رسول ہوں اور یاد رکھو اللہ کا فتح و نصرت کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا"، حضورؐ کی آواز کا سننا تھا کہ مسلمانوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، انابت کا جذبہ ابھرا اور پھر نبی صلعم کے گرد اکٹھا ہو کر کافروں کے مقابلہ میں صف آرا ہو گئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر اہل کفر کے سپہ سالار ابوسفیان نے عافیت اسی میں سمجھی کہ باقی ماندہ فوج کو لے کر بھاگ جائے اور پھر اس طرح سے عارضی شکست فتح میں تبدیل ہو گئی۔

اس معرکہ حق و باطل کے دوران یہ خبر اڑائی گئی کہ (نعوذ باللہ) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شہید کر دیئے گئے ہیں پھر کیا تھا مسلمان بزدل ہو گئے اور یہ سوچنے لگے اب جب کہ نبی ہی موجود نہیں رہے تو پھر دین کا کام کیسے ہو گا۔ چنانچہ پہلی آیت میں یہی بات بیان فرمائی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں جس طرح اس سے پہلے انبیاء و رسل آئے تھے اور دعوت و تبلیغ کا کام کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے اسی طرح سے یہ پیغمبر بھی اپنا فریضہ رسالت ادا کر کے دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ کیا یہ سمجھ کر تم اسلام میں داخل ہوئے تھے کہ یہ نبی ہمیشہ ہمیش زندہ رہنے والا ہے کیا اس شرط کے ساتھ ایمان لائے تھے کہ جب تک نبی زندہ رہیں گے اس وقت تک دین کا کام کریں گے؟ تم نے اسلام قبول کرتے وقت اَسْلَمْنَا لِلّٰہ کہہ کر اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کیا، بِعْنَا اَنْفُسَنَا اللہ کہہ کر تم نے اپنے آپ کو اللہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا، کیا وہ عہد کیا تھا کہ یہ عہد وقتی تھا یہ نبی کی حیات سے بندھا ہوا تھا؟

نہیں! بلکہ یہ دائمی عہد تھا اور کسی بھی شرط کے ساتھ مشروط نہیں تھا۔ تو پھر دل شکستگی کے کیا معنی؟ یہ افسردگی اور پژمردگی کیوں؟ نبی کی اپنی ذمہ داری ہے جو اسے پوری کرنی ہے اور تمہاری اپنی ذمہ داری ہے جیسے تمہیں پورا کرنا ہو گا، یاد رکھو جو لوگ الٹے پاؤں واپس ہوں گے اور شکست خوردہ ذہنیت کا شکار ہوں گے وہ اپنا ہی نقصان کریں گے خدا کے دین کو اس سے کچھ بھی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ وہ لوگ جو ہر حالت میں اپنے عہد پر قائم رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کو بہترین بدلہ سے نوازے گا اپنے شکر گذار بندوں میں شامل فرمائے گا کیونکہ انھوں نے اسلام و قرآن کو اپنے سینے سے لگائے رکھا، اس نعمت کی قدر کی اور کسی بھی حالت میں کار دین سے برگشتہ ہونے کا تصور تک نہیں کیا اس کے برخلاف جو لوگ مایوسیوں کے شکار ہوئے، کار دین چھوڑ بیٹھے، عہد بندگی سے منحرف ہو گئے تو ایسے لوگ خدا کی نگاہ میں کافر ناشکرے قرار پائیں گے

دوسری آیت میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی بھی شخص اس دار فانی سے کوچ نہیں کرتا ہے وقت مقررہ پر مرنا ایک طے شدہ امر ہے۔ تو پھر جب مرنا طے شدہ ہے یہ دنیا چند روزہ تو آدمی کیوں نہ دائمی فلاح و کامیابی کو اپنا نصب العین بنائے۔ اسی راہ میں مرنے کا آرزومند ہو۔ دنیا طلبی کو مقصود بنانا یہ گھاٹے کا سودا ہے چنانچہ آخرت کو نصب العین بنانے والوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ ہم یقیناً اپنے ان شکر گذار بندوں کو انعامات سے نوازیں گے۔

تیسری اور چوتھی میں یہ کہا گیا کہ بہت سے انبیا گذرے ہیں جن کے ساتھ خدا پرست لوگوں نے مل کر دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کی پھر اس راہ میں جو بھی مصیبت آئی پوری خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ نہ ان کی ہمت ٹوٹی اور نہ ان کے دلوں میں کمزوری اور دشمن نہیں پیدا ہوا۔ باطل کے

آگے جھکنے اور ہتھیار ڈالنے کا تصور تک نہیں آنے دیا پھر ساتھ ہی اس پورے معرکۂ خیر و شر میں ان کی زبانوں پر یہ دعا جاری رہی کہ "اے ہمارے رب! ہم سے جو کوتاہی ہوئی ہو معاف کردے، اس کام میں ہم سے جو زیادتی ہوا اس پر بھی پردہ ڈال دے، ہمیں ثابت قدمی عطا فرما، اور دین کے دشمنوں کے مقابلہ میں اپنی نصرت اور مدد سے نواز۔" اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کو دنیا میں انعام و اکرام سے نوازا، غلبہ و تمکین عطا فرمایا۔ جتنا انھوں نے اس راہ میں خرچ کیا تھا اس سے کہیں زیادہ انھیں اس دنیا میں دیا اور آخرت کا بہترین اور ابدی انعام تو ان کے لئے طے شدہ ہے۔

پس آج جو لوگ بھی دعوت دین کا فریضہ انجام دے رہے ہیں انھیں اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ وہ اپنے عہد بندگی کے خود ذمہ دار ہیں۔ اگر ان کے عمائد دین امانت دین کی جدو جہد سے دست کش ہو جائیں، ان کا قائد ان سے رخصت ہو جائے تو بھی انھیں اسی راستہ پر چلنا ہے، یہی کام کرنا ہے، اپنی ساری قوتیں اور صلاحیتیں اسی راہ میں کھپانی ہیں۔ یہ بات ہمارے ذہن میں برابر مستحضر رہنی چاہیے کہ موت تو بہر حال آنی ہے مرنا لازمی ہے تو پھر کیوں نہ آدمی اعلیٰ و اشرف موت مرے کہ اس کی شکل یہ ہے کہ آدمی فریضۂ اقامت دین کو اپنا نصب العین بنائے، دعوت دین کے کام میں لگ جائے، ہر طرح کے خطرات و مصائب کو برداشت کرتے ہوئے زندگی کے آخری لمحے تک حق کی گواہی دیتا رہے تاکہ آخرت میں شہداء علی الناس کی فہرست میں اس کا نام لکھا جائے۔ سابق انبیاء اور ان کے خدا پرست ساتھیوں کا جو نمونہ ان آیات میں پیش کیا گیا ہے اسے سامنے رکھتے ہوئے ہر طرح کی مخالفتوں مزاحمتوں اور ایذا رسانیوں کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا جائے، کمزوری اور دل برداشتگی کو ذرا بھی جگہ نہ دیا جائے اور یہ طے کر لیا جائے کہ جان جان آفریں کے سپرد ہو جائے گی مگر باطل کے آگے ہتھیار ڈالنے کا خیال ذہن میں نہیں آنے دیا جائے گا پھر ہر آن اپنے خدا سے اس کام میں ہونے والی کوتاہیوں اور غلطیوں سے معافی مانگنی چاہیے تاکہ قدم میں ثبات پیدا ہو اس کی تائید و نصرت کے حقدار بن سکیں۔

ان آیات میں تین لفظ استعمال ہوئے ہیں، شاکرین، صابرین، محسنین، شاکرین انھیں کہا گیا جو ہر حالت میں عہد بندگی سے چمٹے رہیں، اسی راہ میں اپنی جان دیں اور اسی راہ میں مرنے کی آرزو رکھیں۔

صابرین وہ لوگ ہیں جو دینی جدو جہد کی مہم میں ہر طرح کی چوٹیں کھانے کے باوجود ہمت نہ ہاریں، عملی کمزوری کا شکار نہ ہوں، باطل کے آگے سرنگوں ہونے کا خیال تک ذہن میں نہ لائیں۔

محسنین ان سب کا جامع ہے۔ تصوف کی دنیا میں احسان کا جو مفہوم ہے اس سے بالکل مختلف مفہوم قرآن پیش کرتا ہے۔ قرآنی مفہوم میں احسان یہ ہے کہ آدمی خدا سے اقامت دین کا عہد باندھے، اپنی زندگی کو رضائے الٰہی کے لئے وقف کردے بندگان خدا کو دین کی طرف دعوت دے، اسلام کو غالب کرنے کی اجتماعی جدو جہد کرے اور دعوت کے ہر مرحلہ میں ہر طرح کی قربانیاں دینے کے لئے تیار رہے "قرآنی محسنین" گوشوں میں بیٹھ کر اوراد و وظائف میں اپنی زندگی نہیں گذارتے بلکہ معاشرہ میں امر بالمعروف نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہیں پھر اس کام میں جتنے بھی مراحل پیش آتے ہیں ان مراحل کے تقاضے پورے کرنے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔

مولانا نے زندگی میں کبھی گالی نہیں دی

صاحب تفہیم القرآن کی وفات کے بعد

تین اہم انٹرویو

جن کے ذریعے قائد تحریک اسلامی کی شخصیت کے کئی گوشے پہلی بار سامنے آتے ہیں :-

تحریر :-
طارق نیازی

سید حیدر فاروقی مودودی

مولانا عاصم نعمانی

پندرہ سال مولانا محترم کے معاون رہے

محمد حنیف

جنھیں بیس سال تک جناب سید کی خدمت کا شرف حاصل رہا

حیدر فاروق مودودی سے خصوصی ملاقات

طارق نیازی

> "ابا جان کی وفات کے بعد اب میاں طفیل صاحب ہمارے لئے باپ کا درجہ رکھتے ہیں، ان کی قربانیاں کسی طرح بھی ابا جان سے کم نہیں، اب ہمیں اللہ تعالیٰ کے بعد انہی کا سہارا ہے"

میں کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ ایک نوجوان بھوکا پیاسا، غم سے نڈھال اور بے حال پھرتا ہے، وہ چلتا ہے تو یوں جیسے کوئی زندہ لاش حرکت کر رہی ہو، لیکن اس کے ضبط کا یہ عالم کہ نہ آنکھ سے کوئی اشارہ نہ چہرے پہ کوئی آثار، وہ کئی دنوں سے سو نہیں سکا، میں نے رات کو اختتامی پچھلے پہر بھی اسے انتہائی کرب کے عالم میں دیکھا ہے، مگر اس کے باوجود اس کے نقش سے ستارۂ صبح کی چمک جھلکتی ہے، اس کا دل سمندر اور اس کی آنکھ جذبوں کی جھیل ہے، صبر وضبط کے سکوت نے اس کے پورے وجود کو سکون جزیرے میں ڈھال دیا ہے۔ میں نے چاہا کہ سکوت و جمود کی اس برف کو پگھلا دوں۔ جذبوں کا غبار بہا دوں لیکن ایسے موقع پر میری ہمت نے میرا ساتھ نہ دیا۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ اس آنکھ میں آنسو دیکھوں جس میں اس کے ابا کی خوشیاں مسکراتی رہی ہیں، ایک بار میں کسی اور سمت جاتے جاتے عین اس نوجوان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کی بھولی بھالی نگاہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور میں دم بخود ہو گیا۔

چند لمحوں کے بعد میری زبان سے نکلا "حیدر صاحب! آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں"۔ میرے الفاظ سن کر وہ کرسی سے اٹھا اور اپنے ابا کے سے کرمفرما لہجے میں بولا "جی فرمائیں!" اور جواب میں میں پھر خاموش تھا۔ بے زبانی میں کہہ ڈالا: "کچھ ابا جی کی باتیں"۔ پھر جملہ درست کرتے ہوئے کہا: "مولانا مرحوم کے بارے میں آپ کے تاثرات؟" اتنا ہی کہا تھا کہ جیسے جذبوں کا طوفان امڈ پڑا "ہمارے تاثرات؟" ہم کیا اور ہمارے تاثرات کیا، ہم تو ایک ایسے درخت کے نیچے کھڑے تھے جس کا سایہ بھی تھا اور پھل بھی۔ آج وہ درخت نہیں رہا، تو ہمارا سایہ ہے نہ پھل۔ ہم سے باتیں کر کے، ہمارے تاثرات لے کر کیا کرو گے؟" اس کی یہی ادا میرے دل میں ترازو ہو گئی۔ میں نے بے اختیار لفظوں کی اس مٹھاس کو اپنے سینے میں جذب کر لینا چاہا اور اگلے ہی لمحے وہ نوجوان جو ایک "انسان" کی صورت پہ ٹوٹ کے بکھر چکا تھا، میرے سامنے ساکت و صامت بت بنا بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے جذبوں کی کرچیاں جمع کر کے اپنے دامن میں سجالیں اور آج یہ آپ کے سامنے بھی رکھ رہا ہوں۔

حیدر صاحب! ایک عظیم باپ کے بیٹے ہونے کے ناطے عام و خاص لوگ آپ سے کیسا رویہ اختیار کرتے تھے؟

وہ ابا جان کو دیکھتے تھے، ان کی روشنی میں ہمارا کوئی مقام نہ تھا۔ اس روشنی میں ہم نے خود کو تیار نہ کیا تھا۔ ہم تو حادثہ کے طور پر ان کے ہاں پیدا ہو گئے تھے۔ جیسے پتھر پہاڑ سے لڑھک جاتا ہے۔ جہاں پڑا رکھا رہ گیا۔ کچھ ایسا ہی لوگ ہمیں پاتے تھے، چنانچہ لوگوں کو ہم سے شکایتیں بھی تھیں۔ لوگ نکتہ چینیاں بھی کرتے تھے۔ یہ سب کچھ وہ ابا جان سے محبت کی بدولت کرتے تھے اس میں ان کا کوئی قصور نہ ہوتا تھا۔ اس میں سراسر ہماری کمزوری کا دخل تھا۔ ہم بہرحال انسان تھے۔ ہم تنقید پر ہم بھی رہ جاتے تھے جس کی ہم معافی چاہتے ہیں، جس کا ہمیں بہت گہرا احساس ہے۔ آج ابا جان کے رونے والے ہم سے زیادہ ہیں ان کے لیے دعائیں کرنے والے اتنے ہیں کہ اگر ہم ساری زندگی بھی ان کے لیے دعائیں کرتے تو اتنا نہ کر پاتے۔ ابا جان ہمارے لیے ایک مشکل راہ چھوڑ گئے ہیں۔ اس راہ کے مسافر کے لیے جو متاعِ سفر چاہیے، اس سے ہم محروم ہیں۔

آپ کی تعلیم و تربیت میں مولانا کا کیا کردار رہا؟

ان کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ وہ ہم سے پوچھتے کیا پڑھ لکھ رہے ہو؟ اسکول کب جا رہے ہو؟ کب آ رہے ہو؟ انہیں قوم کی تعلیم و تربیت ہی سے فرصت نہ تھی۔ ابا جان نے قوم کے بچوں اور ہمارے درمیان کوئی فرق روا نہ رکھا۔ ہم نے جو کچھ بھی کیا ہے، یہ محض اللہ کا کرم ہے۔

ابا جان سے کبھی کوئی شکایت بھی ہوئی؟

کوئی شکایت نہ تھی۔ میں نے فلائنگ کی ہے۔ میں پائلٹ بنوں، ابا جان نے کہا، میری خواہش تھی کہ تم پڑھتے لکھتے، مگر تمہاری خوشی ہے، تو فلائنگ کرو، جتنا خرچ ہوگا میں دوں گا، چنانچہ [illegible] ہزار روپے خرچ کر کے میں نے فلائنگ سیکھی۔ ابا جان نے کسی کام سے منع نہ کیا، وہ ہماری کسی خواہش کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔

حیدر صاحب! آپ بھائیوں میں سے مولانا کس کو سب سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔

ابا جان، عمر فاروق صاحب کو بہت چاہتے تھے، میری بہنوں میں واثقہ کو بہت چاہتے تھے، خدمت میں اسماء کو بہت چاہتے تھے۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے! (آمین)

عمر فاروق صاحب کو چاہنے کی کوئی خاص وجہ تھی؟

جی ہاں! وہ ہم سب سے بڑے تھے، پہلے بچے تھے، سب سے بڑھ کر وہ ان کے نقش قدم پر چلنے والے تھے۔ ہم سب سے بڑھ کر ان کی خواہشوں کو پورا کرنے والے تھے، انہوں نے ابا جان کی خواہش پر عربی میں ایم۔اے کیا تھا، وہ ریاض میں درس قرآن دیتے تھے۔ ابا جان کو بڑی خوشی ہوتی تھی، گھر میں اکثر کہتے تھے، "جگنو (عمر فاروق صاحب کو پیار سے جگنو کہتے) ریاض میں درس دیتا ہے، بہت اچھا درس دیتا ہے۔" وہ اکثر فرماتے تھے، "میرے سارے بچے میرے نقش قدم پر چلیں گے میں نے انہیں رزق حلال کھلایا ہے۔ میں نے انہیں عملی زندگی کا نمونہ دیا ہے۔" آج اللہ کا کرم ہے، ہم سب بہن بھائی نمازی ہیں۔

حیدر صاحب! مولانا گھریلو معاملات میں کیا رویہ اختیار کرتے تھے مثلاً کھانا وقت پر نہیں پکا، مہمانوں کی مہمان داری صحیح طور پر نہیں ہوئی، کپڑے پر وقت نہیں ملے وغیرہ؟

ابا جان کو اپنی ۶۲ سالہ زندگی میں بھی کسی امر پر شکایت کرتے نہ دیکھا۔ ان کی زندگی بڑی متوازن اور منضبط زندگی تھی، وہ ہمیشہ دوپہر ایک بجے کھانا کھاتے تھے، زندگی میں بھی انہوں نے اس معمول میں فرق نہ آنے دیا۔ رات کا کھانا ہمیشہ ۸ بجے کھاتے تھے، انہوں نے کبھی مقررہ وقت کی حد نہیں توڑی، وہ عصر کے وقت چائے پیتے تھے اور اس عادت میں بھی کبھی تبدیلی

نہ آئی۔ ایک دفعہ رات کے کھانے کا وقت ہوگیا، تو امی کو کہنے کے بجائے خود ہی لے لیا، کھانا کھاتے رہے۔ امی باورچی خانہ میں گئیں اور سالن چکھا، تو اس میں نمک کم تھا۔ ابا جان کے پاس آکر کہا: اس میں نمک کم ہے، بتا ہی دیتے۔ "فرمانے لگے "نہیں نہیں ٹھیک ہے۔" مگر امی پلیٹ اٹھا کر لے گئیں اور بقدر ضرورت نمک ڈال کر لے آئیں۔ آپ تمام کام خود کرتے تھے، وہ کسی کو خدمت کا موقع نہ دیتے تھے۔ امی ٹانگیں دباتیں تو فرماتے، رہنے دیں، "ٹانگیں دبانے کی ضرورت نہیں"۔ آخری عمر میں بہت کمزور ہو گئے، چلنے پھرنے میں دقت ہوتی، تو اس وقت تھوڑی بہت خدمت کا گھر والوں کو بھی موقع ملا مجھے بھی یہ سعادت نصیب ہوئی کہ چند بار ہاتھ دھلا دیے پانی پلایا۔ بیٹھنے کے لیے کرسی رکھ دی۔ آج میرا یہی سرمایہ زندگی ہے اور بس ان کی یاد ہے۔

مولانا کو کس قسم کی غذا اور لباس پسند تھے؟

ہمیشہ سفید لباس پہنتے۔ گرمیوں میں بالکل سفید اور سردیوں میں کریم کلر کی بغیر کالر قمیض پہنتے تھے۔ چائے میں شکر بہت تیز استعمال کرتے تھے۔ اروی کا سالن بہت مرغوب تھا۔ اس میں لیموں اور ہری مرچ استعمال کرتے تھے۔ جس دن گھر میں پکتی، بہت خوش ہوتے۔ شاہی ٹکڑے بہت پسند تھے۔ جیل میں تھے تو خود ہی پکاتے تھے۔ والدہ سے کہتے: "تمہیں شاہی ٹکڑے پکانا کیا آتے ہیں، کبھی میں تمہیں پکا کر دکھاؤں گا۔" امرودوں کے بیج جو بہت پسند تھے، لیکن گردوں کا عارضہ لاحق ہوا تو یہ غذا چھوٹ گئی کیونکہ امرودوں کا بیج گردوں کے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔

مولانا محترم کے معالج کون رہے؟ اور کن پر زیادہ اعتماد کرتے تھے۔

جس نے جو بتا دیا علاج کرتے تھے۔ ان کی عادت لوگوں کے خلوص پہ شک کرنے کی نہ تھی۔ آخر عمر میں کراچی کے ایک صاحب نے ایک معالج بھیجا جو جوڑوں کے دردوں کا علاج کرتا تھا انہوں نے آکر ابا جان پر مشقیں شروع کر دیں۔ وہ ان کے پیروں پر کھڑے ہوکر ضربیں لگاتے اور یوں دردوں کا علاج کرتے۔

ایک دن صفدر صاحب نے کہا: مولانا! اس سے تو بہت زیادہ اذیت ہوتی ہوگی۔

"فرمایا، "اتنی سخت اذیتیں برداشت کی ہیں کہ اس اذیت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ ہر شخص کو اپنا اپنا شوق پورا کر لینے دو۔"

صفدر صاحب نے گھٹنے دیکھے تو اُن پر نیل پڑ چکے تھے جہاں تک معالجین کا تعلق ہے اتنے معالج بدلے جا چکے ہیں کہ اُن کے نام یاد رکھنا بھی محال ہے۔

حیدر صاحب! مولانا نے کبھی غصے ہو کر آپ کو مارا بھی؟ ان کی سرزنش کا انداز کیا ہوتا تھا؟

ابا جان کو غصہ بہت کم آتا تھا، وہ بہت ٹھنڈے مزاج کے انسان تھے۔ آخری عمر میں دردوں کی تکلیف کے باعث طبیعت میں جھنجھلاہٹ آگئی تھی۔ ایک دن میں فجر کی نماز کے بعد جب ٹہلنے نکل گیا۔ واپس آیا تو برآمدے میں بیٹھے ہلکی آواز میں قرآن پڑھ رہے تھے۔ میں گزرا تو کہنے لگے:

"تم کدھر چلے جاتے ہو، کہاں واہی تباہی پھرتے رہتے ہو؟ میرا ناشتہ تیار نہیں ہوا، جاؤ فوراً سے کہو ناشتہ تیار کرے۔"

دراصل ابا جان ایک عملی انسان تھے۔ وہ اپنی زندگی کا ایک منٹ بھی ضائع نہ کرنا چاہتے تھے جب تک صحت تھی وہ ہر کام خود کر لیتے تھے۔ جب صحت ڈانواں ڈول ہوئی اور ان سے خود کوئی کام نہ ہوتا تھا تو وہ جھنجھلا جاتے تھے۔ ایک نفسیاتی معالج نے کہا۔ مولانا کے جوڑوں کا درد ایک نفسیاتی مرض ہے۔ میں مولانا کے پاس جاؤں گا، ان سے ملوں گا۔ ان کے ساتھ بیٹھوں گا، گپ شپ کروں گا، تو وہ آپ سے آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔

مولانا نے فرمایا:

"مجھے زندگی بھر گپ شپ کا شوق رہا ہے نہ فرصت۔ ان سے کہہ دو آپ کا شکریہ۔"

ہم بچپن میں شرارتیں کرتے تھے، وہ ناراض ہو جاتے۔ ابا جان عموماً دوپہر کو اخبار اور رات کو رسائل کا مطالعہ کرتے تھے اس دوران ہم شور کرتے اور ان کے مطالعہ میں حرج ہوتا تو وہ ہمیں

کرتے اور ہم سمجھ جاتے کہ وہ ناراض ہیں۔ کبھی جسمانی سزا کی نوبت نہ آئی۔

حیدر صاحب! ہر باپ اپنی اولاد سے بڑی بڑی امیدیں باندھتا ہے۔ اس پہلو سے مولانا کو کس مقام پر دیکھنے کے آرزومند تھے اور آپ نے کہاں تک ان کی امیدوں اور آرزو کو پورا کیا؟

ہم بالکل ان کی امیدوں کو پورا نہ کر سکے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ ہمیں اپنے مقصدِ حیات کی نذر کرتے۔ ہماری دعا ہے کہ ہم ان کے مقصدِ زندگی میں ختم ہو جائیں مگر ع این سعادت
بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

شادی و غم کے موقعوں پر مولانا کی کیفیت کیا ہوتی تھی؟

ابا جان بنیادی طور پر جذباتی انسان نہ تھے۔ حد درجہ کے متوازن انسان تھے۔ وہ نہ خوشی میں پاگل ہوتے نہ غم میں دیوانہ۔ خوشی میں خوشی اظہار کرتے۔ غم بھی ہوتا تھا مگر اتنا نہیں کہ جیسے دوسرے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر شہید کی شہادت اور مشرقی پاکستان کے سقوط کے موقع پر انہیں انتہائی دکھ ہوا۔ پھر جب مشرقی پاکستان سے ان کے ساتھیوں کی شہادتوں کی خبریں آئیں تو یہ غم ان کے چہرے اور آواز سے ظاہر ہونے لگتا۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اولاد اور بھائی کی طرح عزیز رکھا۔ وہ ان کے غم کو ایسے ہی محسوس کرتے ہیں۔

وہ ایسے موقعوں پر اپنے عزیزوں اور تعلق داروں کے ہاں جایا کرتے تھے؟

جی ہاں! جب تک چل سکتے تھے جاتے تھے، پیدل بھی جاتے رہے۔ مولانا نصیر حسین صاحب (انچارج شعبہ مالیات جماعت اسلامی پاکستان) کے والد صاحب کا انتقال ہوا تو ابا جان سے میاں صاحب تک کا تذکرہ دیتے آئے۔ فقیر حسین صاحب منع کرتے رہے لیکن آپ نہ مانے۔ جب صحت جواب دے گئی، تو آنا جانا معطل ہو گیا۔ لوگ دعوتیں بھی دیتے تھے۔ بالخصوص شادی کے موقعوں پر۔ مگر جواب نہ فرماتے۔ آپ کہیں شادی

میں تو چلا جاؤں گا لیکن مرگ میں کیا کہہ کر انکار کر دوں گا"!

حیدر صاحب! مولانا کو اپنے دوستوں میں سب سے زیادہ تعلق خاطر کس سے رہا؟

میاں طفیل محمد صاحب سے۔!

اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟

میاں صاحب کو جو ابا جان سے محبت تھی، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی بھر انہوں نے ابا جان کے ساتھ جو سلوک کیا، ایک سگا بھائی بھی اتنا ہی کر سکتا ہے، اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لوگ میاں صاحب پر اعتراض کرتے تھے، تو ابا جان فرماتے تھے: میری سالہا سال کی کوششوں کے نتیجے میں جو بہتر انسان تربیت پا سکا ہے، وہ میاں صاحب ہیں۔ اگر لوگ ان پہ اعتراض کرتے ہیں، تو میں ان کے جواب میں بے بس ہوں۔ میاں صاحب میں جو خوبیاں ہیں، وہ ایک انسان میں زیادہ سے زیادہ ہو سکتی ہیں۔ میاں صاحب کو ابا جان سے بے پناہ محبت تھی۔ انہوں نے ابا جان کے کسی فعل کو صحیح اور غلط کے ترازو میں نہیں تولا تھا۔ ابا جان کہتے تھے، میاں صاحب سنتے اور اسے پورا کرتے تھے۔ مجھے معلوم ہے، جب ابا جان کو گردے کی تکلیف ہوئی اور جب ۲۰،۲۰ گھنٹے انہیں پیشاب کی تکلیف رہی، اس وقت جو حالت میاں صاحب کی تھی، اس پر میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ وہ بلاشبہ قرونِ اولیٰ کے لوگوں میں سے ہیں۔ لوگ ان کی عظمت سے بھی ناواقف ہیں، اس کا احساس بھی ہمیں ان کے چلے جانے کے بعد ہی ہوگا۔ میاں صاحب کی قربانیاں کسی طرح بھی ابا جان سے کم نہیں۔ وہ ہر طرح سے اہل ہیں کہ جس منصب پہ ہیں، اس منصب پر رہیں۔ ہمارے تو اب وہی باپ ہیں۔ اللہ کے بعد انہی کا سہارا ہے۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ کسی شخص کو ان کی سیاست سے اختلاف ہو سکتا ہے، ان کے گہرے تقویٰ اور بے پایاں خلوص سے انکار ممکن نہیں۔

مولانا محترم! اپنی بے پناہ علمی، فکری، سیاسی اور جماعتی مصروفیات میں سے اہلِ خانہ کے لیے بھی وقت نکال لیتے تھے؟

کھانے کے اوقات میں وہ اہلِ خانہ سے ملتے تھے۔ انہیں وقت ضائع کرنے کی عادت تھی نہ فرصت۔ اپنے والد احمد حسن مرحوم کی وفات کے بعد بچپن ہی سے ان کی زندگی کی جد و جہد کا آغاز ہو گیا تھا اور انہوں نے ساری زندگی اپنے مقصد زندگی کو بنانے اور سنوارنے میں صرف کر دی، جس کا ماحصل اللہ کی زمین پر اللہ کے قانون کا نفاذ تھا۔

مولانا محترم کے پڑھنے لکھنے کے اوقات اور ان کے روزانہ کے معمولات کیا تھے؟

جب صحت تھی، عشاء سے فجر تک علمی کام کرتے، جب ان کی صحت بالکل تباہ ہو گئی، تو دن کو علمی کام کرتے، مگر اس دوران میں ملاقاتیں اور جماعت کا کام بھی چلتا رہتا۔ مصروفیات کم کرنے کی غرض سے انہوں نے جماعت کی امارت سے بھی سبکدوشی اختیار کر لی، مگر ان کی مصروفیات میں کوئی کمی نہ آئی۔ سارا سارا دن جب ملنے والوں کے قافلے آتے رہتے، تو اکثر فرماتے: "لوگوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے کوئی کام نہیں کرنے دیں گے، لوگ میرا سارا وقت باتوں اور فضولیات میں اڑا دینا چاہتے ہیں" آخری عمر میں سیرت رسولؐ پر سارا کام مکمل کر لیا تھا۔ نوٹس تیار تھے، مطالعہ مکمل ہو چکا تھا، ترتیب انجام پا چکی تھی، سب کچھ مکمل تھا، بس اسے لکھنا باقی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بلا لیا۔ اب ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ سیرت مکمل ہو جائے، مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس پر ہم راضی برضا ہیں۔

حیدر صاحب! مولانا محترم جب گھر سے باہر ہوتے تو آپ سے خط و کتابت بھی کرتے تھے؟ اس میں خیر و عافیت کے علاوہ بھی آپ سے کچھ باتیں کہتے تھے؟

ابا جان گھر سے باہر ہوتے تو بہت کم خط لکھتے تھے۔ کبھی ضرورت پیش آتی بھی تو ضروری بات، اور ضروری ہدایت تک محدود رہتے۔ ابھی امریکہ سے حسین فاروق صاحب کو خط لکھا جس میں ہدایت کی کہ ہم سب بہن بھائی انہیں الگ الگ خط لکھیں۔ مگر ہم ان کی اس آخری خواہش کو پورا نہ کر سکے اور وہ اس سے پہلے ہی اس دنیا سے تشریف لے گئے۔

مولانا محترم، آپ کو اکثر و بیشتر کیا نصیحت کرتے تھے؟ جو کچھ حاصل کرنا ہے، جو کچھ بنیاد ہے، میری زندگی میں کر لو، نہ معلوم بعد میں کیا حالات پیش آئیں۔ ہمارے اچھے کام سے انہیں خوشی ہوتی۔ نماز میں ہم سے تاخیر ہو جاتی تو انتظار فرماتے، حالانکہ ابا جان نماز میں کسی کا انتظار نہ کرتے تھے۔

مولانا، اسلامی خطوط پر آپ کی زندگی سے مطمئن تھے، یا اس میں کوئی تبدیلیاں دیکھنا چاہتے تھے؟

وہ جس مقام پر تھے، اس معیار و مقام کی ہماری زندگی نہ تھی۔ والدہ محترم ہمارے بارے میں ابا جان سے فکر مندی کا اظہار کرتیں تو فرماتے: "مجھے اللہ سے امید ہے، میں نے قوم کے بچوں کو راہ دکھائی ہے، اللہ میرے بچوں کو بھی بے راہ نہیں کریں گے، میں نے اپنی زندگی اور اپنا کردار ان کے سامنے پیش کیا ہے۔ اگر میری زندگی کو صحیح راستے پر دیکھتے ہیں، تو اس پر چلیں، کوئی اور راست چاہتے ہیں تو وہ اختیار کریں۔" ایسا شفیق باپ شاید ہی کسی کا ہو۔

ہم ان کی زندگی میں ان کی نصیحت کے مطابق عمل نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے بعد ہی ہمیں موقع عطا فرما دے۔ (آمین)

مولانا کو آپ سے کچھ شکایات بھی رہیں؟ رہیں تو کس نوعیت کی؟

ہمیشہ ان کو ایک ہی شکایت رہی کہ ہم ان کے معیار پر پورے نہ اترتے تھے، اگرچہ انہوں نے زندگی بھر اس کا کبھی اظہار بھی نہ فرمایا تھا۔ ان کے معیار پر پورا اترنا بھی ہمارے بس سے باہر تھا۔

حیدر صاحب! مولانا محترم دنیائے اسلام کے دینی علمی و فکری امام تھے۔ دنیا نے مولانا کی اس حیثیت کو ان کی کتب اور فکر سے پہچانا۔ آپ نے اپنے باپ کی اس حیثیت کو کس طرح پہچانا؟

ہم نے ان کی پوری زندگی دیکھی ہے۔ لوگوں نے انہیں کتابوں سے پہچانا ہے اور ہمارے سامنے ان کی کتابِ زندگی ہے۔ ان کی زندگی اور زندگی کے کردار میں کبھی کوئی تضاد نہ تھا یہی مومن کا زیور ہے اور اسی سے عمر بھر ابا جان کو آراستہ دیکھا۔

کیا آپ اپنے باپ کو اپنا دینی پیشوا اور سیاسی رہنما بھی مانتے تھے؟

ہم ان کو سب کچھ مانتے تھے۔ وہ ہمارے دینی رہنما بھی تھے اور سیاسی پیشوا بھی، امام بھی تھے، اور استاد بھی تھے، غرض وہ سب کچھ تھے۔

حیدر صاحب! آپ کو مولانا سے کبھی کوئی علمی فکری یا سیاسی اختلاف بھی رہا ہے؟

اس مرتبہ کی شخصیت سے اختلاف کرنے کے لیے بھی جو کم سے کم معیار ہونا چاہیے تھا ہم تو اس پر بھی پورے نہ اترتے تھے پھر اختلاف کیا معنی؟

مولانا محترم نے کبھی آپ کو اسلامی جمعیت طلبہ یا جماعت اسلامی میں شمولیت کے بارے میں بھی تلقین کی؟

کبھی نہیں انہوں نے کوئی نظریہ یا خیال ہم پر نہیں ٹھونسا انہوں نے ہمارے سامنے اپنی زندگی رکھی اور پھر عمل کی آزادی دی۔

ابتدائی اور آخری عمر میں آپ کی فرمانبرداری یا حکم عدولی پر مولانا کا رویہ کیا ہوتا؟

جوڑوں کی درد کے باعث، آخری عمر میں ان کے اندر جھنجھلاہٹ سی آ گئی تھی ورنہ ہم نے کوئی ایسی بات ان میں نہ دیکھی تھی۔

مولانا آپ سے نجی کام بھی لیتے تھے (مثلاً جوتے پالش کر دینا، کپڑے استری کر دینا وغیرہ)؟

زندگی میں چند دفعہ یہ سعادت حاصل ہوئی۔ ابا جان کو ہر کام خود کرنے کی عادت تھی۔ وہ دوسروں سے کسی بھی معاملہ میں کوئی خدمت لینا پسند نہ کرتے تھے۔ ہمیں افسوس ہے کہ وہ بہت کم، بہت ہی کم عرصہ کے لیے ہم میں رہے۔ اس عرصہ میں ہم ان سے اپنی کوتاہیوں کی معافی بھی نہ مانگ سکے تھے کہ وہ رخصت ہو گئے۔ ہم تو یہ سوچ بیٹھے تھے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا میں آئے ہیں، مگر ۲۲ ستمبر کو پتہ چلا کہ نہیں۔ ان کا قیام تو بہت ہی مختصر عرصہ کے لیے تھا۔

مولانا اگر ناراض ہوتے تو آپ کس طرح انہیں خوش کرنے کی تدبیر کرتے؟

وہ کبھی ناراض ہوئے نہیں۔ ایک دفعہ والدہ نے کہا کہ تمہاری فلاں بات ابا جان کو ناگوار گزری ہے تو میں انہیں ساتھ لے کر ابا جان کے پاس گیا۔ ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ ان کے قدموں پر سر رکھ دیا اور معافی کا خواستگار ہوا۔

اپنے بہن بھائیوں میں سے میں واحد ہوں کہ جسے ابا جان کے پاؤں چھونے اور قدم چومنے کی سعادت نصیب ہوئی اور پھر معاف بھی فرما دیا۔

والد نے کہا: "اب اس کے لیے دعا بھی کریں" تو فرمایا: "میں تو ہر وقت دعا کرتا ہوں" کاش ہمیں اس وقت اندازہ ہوتا۔ آج ان کی ایک ایک مہربانی، ان کا ایک ایک کرم، ان کی ایک ایک محبت، ان کی ایک ایک سرزنش یاد آتی ہے، مگر ہم بے بس ہیں، پھر بھی راضی برضا ہیں۔ آج سوچتا ہوں، ان کی محبتوں کو کیسے دل سے نکال سکتا ہوں؟

مولانا محترم سے متعلق کوئی یادگار واقعہ؟

ان کی پوری زندگی ہمارے لیے واقعہ تھی۔ ان کا ایک ایک عمل ان کا ایک ایک کرم واقعہ تھا۔ مجھے بچپن میں جانور (مرغیاں، بطخ، کبوتر وغیرہ) پالنے کا بہت شوق تھا۔ میں ہر وقت کوئی نہ کوئی مرغی گود میں دبائے رکھتا۔ ایک دن دیکھا اور بلا کر کہا: "ہر وقت اس کو گود میں دبائے رکھتے ہو۔ لاؤ اس کا تم سے نکاح پڑھا دوں" میں چلا گیا تو فرمایا "جاؤ اس سے تمہارا نکاح پڑھا دیا۔" جب وہ جیل میں ہوتے ہم والدہ کے ساتھ ملنے جاتے تو وہ ہمیں ساتھ بٹھا

کھلاتے تھے۔ فرماتے تھے: "جیل میں جب بھی کوئی اچھی چیز کھاتا ہوں تو مجھے اپنے بچے بہت یاد آتے ہیں" وہ ہمارے لیے اپنا کھانا بچا کر رکھتے تھے اور ہمیں کھلا کر بہت خوش ہوتے تھے۔

مولانا محترم کو اپنی والدہ سے کس قدر انس تھا۔

ابا جان کو والد اتنی چھوٹی عمر میں چھوڑ گئے تھے کہ ان کی تربیت بھی مکمل نہ ہوئی تھی۔ والدہ ہی نے تربیت کی۔ وہ بہت صابر و شاکر خاتون تھیں۔ والد اور چچا (مولانا ابوالخیر مودودی) کہتے تھے "ہم نے ان کو کبھی سفید لباس کے علاوہ رنگین کپڑے پہنے نہیں دیکھا" "ہم نے انہیں جب بھی دیکھا، نماز میں دیکھا۔ روزے میں دیکھا اور تسبیح و تہجد میں مصروف دیکھا"۔ وہ ہمیں صبح فجر کی اذان کے وقت سے اٹھانے لگتیں۔ ہم سے دیر ہوتی تو فرماتیں: "جلدی اٹھ جاؤ ورنہ شیطان کان میں پیشاب کر دے گا" وہ فرماتی تھیں "ایک میں ہوں اور دو میرے بچے (والد اور چچا) اور ہمارا کوئی نہیں" "منا" ابا جان کو پیار سے منا کہتی تھیں، بے والہانہ محبت تھی۔ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئیں تو والد گئے اور کہا "اماں بی! حکیم شریف آئے ہیں، ان کو دکھانے کے لیے لے آؤں" تو فرمایا "بیٹا! نہ کسی شریف کو دکھاؤ، نہ کسی بدمعاش کو" اور اس کے ساتھ ہی انگلی اٹھا کر کہا "من مریضم تو طبیبی" اور پھر جہان فانی سے رخصت ہو گئیں۔ ان کے جیتے جی ابا نے ان کی بہت زیادہ خدمت کی۔

مولانا عاصم نعمانی کا انٹرویو

آج میں ایسے بزرگ کے سامنے بیٹھا ہوں جنہیں اس صدی کے بزرگ ترین انسان کی معاونت کرتے ہوئے پندرہ سال گزرے ہیں۔ ان کے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں ان کے قویٰ میں بجلی کی سی قوت بھی باقی نہیں رہی اور آخری صدمے نے تو انہیں رلا رلا کر اور ہلا کے رکھ دیا ہے۔ مجھے وہ لمحہ یاد ہے جب سید مودودی اسلام آباد کے ہوائی مستقر پر جہاز کی سیڑھیاں اتر رہے تھے، ان کے پیچھے ضروری سامان سے لدے پھندے ایک بزرگ بھی تھے، جو جناب سید کو آخری سفر پر روانہ کرنے لاہور سے اسلام آباد پہنچے تھے۔ یہ بزرگ محمد سلطان صاحب ہیں جنہوں نے اپنے عربی نام "عاصم نعمانی" سے بڑی شہرت پائی اور ۱۹۶۵ء سے لے کر سید مودودی کے "دم رخصت" تک ان کے ذاتی معتمد کی حیثیت میں ان کا دست و بازو رہے۔ آج ان پر "اعتماد" کرنے والا نہ رہا تھا، تو مجھے دیکھتے ہی ان پر رحم آ گیا۔ میں نے سنا کہ وہ کہہ رہا تھا!

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اٹھ جانے سے عالم اسلام یتیم ہو گیا ہے" لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا "یہ داغ صرف میرے ہی حصے میں آیا ہے" اگلے صفحات میں اسی دل داغ داغ کی کہانی ہے۔

نعمانی صاحب! آپ کب سے مولانا محترم کے ساتھ کام کر رہے ہیں؟

مجھے مولانا محترم کی خدمت میں رہتے ہوئے پندرہ سال ہو گئے ہیں۔ مجھے یہ سعادت قابلیت یا علمی استعداد کی بنا پر نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل خاص سے حاصل ہوئی ہے کہ اتنی طویل مدت سے مولانا کی خدمت کر رہا ہوں اور ان کے قریب تر ہوں۔

نعمانی صاحب! آپ کا کبھی مولانا محترم سے اختلاف رائے بھی ہوا؟

اختلاف رائے ہوا، مگر علمی، فکری یا سیاسی بنیاد پر نہیں، بلکہ بعض امور سمجھنے کے لیے!

مولانا محترم، دفتری امور میں مداخلت یا معاونت کو پسند کرتے تھے؟

مولانا محترم دفتری معاملات اور نجی امور میں بڑی سلیقہ مندی کا ثبوت دیتے تھے۔ کبھی ایسا نہ ہوتا تھا کہ کوئی آدمی دفتر کی کوئی چیز ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دے کیونکہ اس کا مولانا کو فوری طور پر احساس ہو جاتا تھا۔ انہوں نے دفتر کی ہر شے بڑے سلیقہ اور ترتیب خاص سے رکھی ہوئی تھی،

وہاں سے ہٹ کر ترتیب بگاڑنے دینا نہیں چاہتے تھے۔ اگر بعض اوقات مولانا کی غیر موجودگی میں دفتر کی کوئی چیز اٹھا کر اسے کسی غیر مخصوص جگہ پر رکھ دیا، تو مولانا دفتر میں تشریف لاتے ہی سب سے پہلے اس چیز کی ترتیب از خود درست فرما لیتے۔ بہر حال یہ ترتیب اور سلیقہ ان کا اپنا تھا، اس میں مداخلت کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ ترتیب اشیاء میں اس قدر یقین تھا کہ ایک بار مجھ سے فرمایا جس ترتیب سے میں نے اپنی کتب رکھی ہیں، اگر کبھی بجلی کی رو فیل ہو جائے، تو اندھیرے میں بھی میں اس ترتیب کے سہارے مطلوبہ کتاب تلاش کر لوں گا۔ ایک مرتبہ مجھے ایک کتاب لانے کے لیے کہا، چنانچہ میں نے الماری کھول کر کتاب لا دی۔ بعد میں میں نے وہ کتاب واپس الماری میں لا کر رکھ دی، مگر واپس رکھتے ہوئے میں اس کتاب کی پہلی ترتیب بھول گیا تھا دوسرے روز مولانا نے دیکھا، تو انہیں فوراً محسوس ہوا، چنانچہ انہوں نے از خود مذکورہ کتاب کو اس کی ترتیب دی ہوئی جگہ میں رکھ دیا۔

نعمانی صاحب! مولانا محترم بے پناہ سیاسی و جماعتی مصروفیات میں سے علمی و فکری کاموں کے لیے وقت کیونکر نکال لیتے تھے؟

بلاشبہ یہ مولانا محترم کا حیرت انگیز کارنامہ ہے، جو ہم جیسے کمزور ہمت انسانوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ جس زمانے میں مولانا کی صحت اچھی تھی اور آپ امیر جماعت بھی تھے، دن بھر جماعتی کام، ملاقاتیں، دورے، تقاریر، پیغامات اور ہمہ وقت مصروفیت رہتی جس سے تصنیفی اور روزانہ کا دفتری کام متاثر ہوتا، اس کمی کو مولانا رات کو پورا کرتے۔ دن کی تھکا دینے والی مصروفیات کے باوجود وہ رات کو کام کرتے۔ انہیں زندگی میں آج کا کام کل پر ڈالنے کی کبھی عادت نہیں رہی، چنانچہ انہیں کام کو مقررہ وقت پر انجام دینے کے لیے بعض اوقات رات رات بھر جاگنا پڑتا ـــــ اس رت جگے میں انھوں نے کبھی اپنی صحت اور آرام کا خیال نہ رکھا۔ نتیجۃً آخری عمر میں ان کی صحت کی دیوار گرنے لگی اور پھر علمی مشاغل معطل ہو گئے گذشتہ سوا، ستر دو ماہ سے تو وہ بالکل کوئی علمی کام نہ کر سکتے تھے اس عرصہ میں وہ مطالعہ اخبارات اور مختصر ملاقاتیں ہی کرتے۔

مولانا محترم کی ذات سے وابستہ کوئی یادگار واقعہ؟

مولانا کی ذات سے وابستگی کے پندرہ سال مسلسل یادگار واقعہ ہیں .... انہوں نے اپنے کردار و عمل سے زندگی کی وہ راہ سمجھائی جو آج کے دور میں کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ ... جہاں تک کسی متعین واقعہ کا تعلق ہے تو مجھے ایک ایسا ہی واقعہ یاد آ رہا ہے جس کا تعلق مخالفین کے بارے میں مولانا کے رویے سے ہے۔ مولانا کے بڑے مخالفین، مولانا پر بڑے اوچھے اور رذیل حملے کرتے ...... مگر مولانا گالیاں سن کر بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے ..... آج سے بارہ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب ایک اخبار لائے۔ اس اخبار میں ایک نامور بڑے بزرگ عالم دین نے مولانا کے بارے میں لکھا تھا۔

"مولانا مودودی اسلام کا ایک ایک ستون گرا رہے ہیں ... نتیجۃً وہ صرف مسلمانوں کو بلکہ اپنی عاقبت کو بھی خراب کر رہے ہیں"۔ مولانا نے اخبار دیکھ کر ایک طرف رکھ دیا اور صرف اتنا کہا: "ہو سکتا ہے میں اس سے بھی برا ہوں"۔

... مولانا ہمیشہ مخالفین کا ادب سے نام لیتے ..... ان کے خلاف کبھی پروپیگنڈا نہ کرتے ..... مولانا کے بارے میں ایک تاثر یہ بھی ہے کہ وہ ضدی اور خود رائے تھے ..

..... مجھے یاد ہے ایک بزرگ نے ان کے ساتھ بعض مسائل پر اختلاف کیا اور بعد ازاں اپنی اختلافی رائے کو شائع کر دیا .... اختلاف کرنے والے بزرگ نے حوالے دے کر اختلاف کیا تھا ..... وہ حوالے ٹھیک اور مکمل شکل میں تھے ..... ان بزرگ کی شائع شدہ اختلافی رائے پڑھنے کے بعد مولانا نے مجھ سے فرمایا: "فلاں کتاب نکال دو" میں نے مطلوبہ کتاب نکال کر دے دی۔ دوسرے دن مولانا نے فرمایا کہ اسے واپس رکھ دو ..... اور ساتھ ہی کہا، صاحب مضمون کو پڑھنے کے بعد میں نے اپنی کتاب

دوبارہ دیکھی ہے اور مجھے کوئی علمی و فکری بات ایسی نظر نہیں آئی جو قابلِ اعتراض ہو، لہٰذا معترض کی یا تو نیت ٹھیک نہیں یا فکر صحیح نہیں۔

نعمانی صاحب! مولانا سے اندرون و بیرون ملک سے ملنے والے وفود کی اوسط کیا تھی؟ کبھی انھوں نے کسی کو ملنے سے انکار بھی کیا تھا؟

اس معاملہ میں بھی مولانا بڑے فراخ حوصلہ تھے۔ بعض اوقات میں محسوس کر لیتا اور مولانا سے عرض بھی کر دیتا کہ زیادہ ملاقاتوں کے نتیجے میں صحت پر اثر پڑ سکتا ہے، مگر مولانا نے صحت کو کبھی عذر نہ بنایا ... بعض اوقات ملنے والے وفد یا شخص کے بارے میں، میں ملاقات مؤخر کر دینے کا مشورہ دیتا تو آپ انکار فرما دیتے اور کہتے: "جب وہ تشریف لے آئے ہیں تو پھر مل لینے دیں"۔ جب بیماری بڑھ گئی تھی تو ہم ملنے والوں کو ملنے سے روک لیتے تھے، مگر اس روک دینے کی اطلاع مولانا کو نہ کرتے تھے ... مجھے یاد نہیں ہے کہ مولانا نے کبھی تھکاوٹ یا مصروفیت کو عذر بنا کر ملنے سے انکار کیا ہو، بعض اوقات کھانے کے وقت ملاقاتی آجاتے، سونے کے وقت آجاتے، جب مولانا دفتر سے اٹھ رہے ہوتے تو جونہی مولانا کو اطلاع دی جاتی وہ بلا کسی عذر کے بلا لیتے۔

نعمانی صاحب! علمی دینی ملکی اہم شخصیات میں سے مولانا کے سب سے زیادہ قریبی تعلقات کس سے تھے؟

اس کا صحیح جواب تو مولانا محترم ہی دے سکتے تھے، مگر سوال اتنا نازک ہے کہ، اغلب ہے کہ مولانا بھی اس کا جواب نہ دیتے ... میرا مشاہدہ یہ ہے کہ مولانا ہر ایک سے ایک جیسی فراخدلی اور خندہ پیشانی سے ملتے تھے، ان کو امتیازی سلوک نہ کرتے تھے، بہرحال میرے مشاہدہ میں ہے کہ ذاتی دوستوں میں چوہدری محمد علی صاحب (سابق وزیر اعظم پاکستان) کو وہ بہت چاہتے تھے۔ چوہدری صاحب بیمار رہنے کے سبب کم ہی مولانا کے پاس ملنے آتے، مگر مولانا ان کے بارے میں باقاعدگی سے پوچھواتے تھے اور ان کی خیریت سے مطلع رہتے تھے .... اسی طرح نواب مشتاق احمد گورمانی (سابق گورنر) سے بھی دوستانہ مراسم تھے .... نوابزادہ صاحب اکثر ملنے تشریف لاتے .... اے کے بروہی صاحب (سابق وفاقی وزیر قانون) سے بھی مولانا کے تعلقات دوستانہ اور بے تکلفانہ تھے .... جسٹس افضل چیمہ صاحب سے بھی تعلقات کی نوعیت مشفقانہ اور بزرگانہ تھی۔ وہ جج کے دور میں بھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے ملنے آتے تھے اور اب بھی جب اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ہوئے تو بیشتر دفعہ آتے رہے۔ آغا شورش کاشمیری مرحوم سے مولانا کے تعلقات بہت مخلصانہ اور دوستانہ تھے۔ آغا صاحب جب بھی آتے مولانا کے دروازے ان پر کھلے تھے۔

مولانا محترم کے اوقاتِ مطالعہ کیا تھے؟

مولانا محترم عشاء پڑھ کر رات کا کھانا کھاتے اور کھانے کے اور مطالعہ کرتے ..... اور اسی طرح یہ تصنیفی و تالیفی کام انجام دیتے .....

نعمانی صاحب! مولانا سے زیڈ۔ اے بھٹو اور جنرل ضیاء الحق دونوں ملنے آئے تھے۔ ان دونوں کی مولانا سے ملاقات کی تفصیل اور تاثر بتا سکیں گے؟

بھٹو صاحب کی تفصیل تو مجھے معلوم نہیں کیونکہ انھوں نے آنے سے پہلے فون پر ہی مولانا سے کہہ دیا تھا کہ وہ تنہا ملیں گے؛ البتہ ان کی آمد بڑے شاہانہ طمطراق سے ہوئی، حفاظتی انتظامات غیر معمولی تھے۔ خود بھٹو صاحب بڑے محتاط اور پریشان نظر آتے تھے ..... سیکورٹی کے لوگ باوردی بھی تھے اور سفید کپڑوں میں بھی خاصی تعداد میں تھے .... بھٹو صاحب ملاقات کے مقررہ وقت کے مطابق ٹھیک وقت پر پہنچے تھے، ..... جہاں تک جنرل ضیاء کا تعلق ہے، ان کی آمد کا انداز بالکل عامیانہ تھا۔

ضیا صاحب وقت مقررہ سے پہلے پہنچ گئے تھے۔ ضیا صاحب دو گاڑیوں میں آئے تھے جب کہ سابق وزیر اعظم کے ساتھ گاڑیوں کا طویل سلسلہ تھا۔

مولانا محترم، اخبارات میں ہونے والی اپنی تنقید پر کیا ردعمل فرماتے تھے؟

مولانا نظر انداز کر دیتے تھے۔ وہ فرماتے تھے "جتنا وقت اپنی صفائی میں لگا دوں گا چاہتا ہوں کہ اتنا وقت دین کے کام میں لگا دوں۔"

نعمانی صاحب! مولانا صاحب اپنے پیچھے بہت زیادہ علمی، سیاسی و تحریکی ورثہ چھوڑ گئے ہیں ہر وارث کی طرح آپ نے مولانا کو بھی اپنے ورثہ کے بارے میں کبھی متفکر پایا کہ وہ صحیح ہاتھوں میں منتقل ہوا ہے یا نہیں؟

اس بارے میں مولانا کو کبھی متفکر نہیں پایا۔ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے "جب تک زندہ رہوں، تیرے دین کی خدمت کے قابل رہوں۔" ان کو یہ کبھی فکر نہیں رہی کہ میرے بعد کیا ہوگا؟ انہوں نے یہ معاملہ اپنے اللہ پہ چھوڑ رکھا تھا۔

مولانا محترم کا ذوق مطالعہ کیا تھا۔

مولانا کو مطالعہ کا بے پناہ شوق تھا۔ ایک روز ازراہ تفنن فرمایا "میں چاہتا ہوں کہ میری قبر میں بھی اینٹوں اور تختوں کے بجائے کتابیں لگا دی جائیں۔"

مولانا محترم نے کسی فرد کو اپنے علمی و فکری جانشین کی حیثیت سے بھی آگے بڑھایا؟

مولانا محترم کو اللہ تعالیٰ نے جو فہم و بصیرت عطا فرمائی تھی، وہ قابل رشک ہے۔ ایسی مثال کئی صدیوں میں مل سکتی۔ لیکن آپ کے سوال کے جواب کے لئے اتنی بات عرض کرتا ہوں کہ مولانا کے ساتھ کام کرنے والوں میں سے ملک غلام علی صاحب پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ ملک صاحب ایک طویل عرصہ تک مولانا محترم کے زیر تربیت رہے ہیں اور ان کی زیر نگرانی کام کرتے رہے ہیں۔ وہ علمی و دینی مسائل میں ملک صاحب پر اعتماد کرتے تھے۔ بہت کم ایسے موقع آئے کہ کسی علمی مسئلہ پر ملک صاحب کی تحقیق پر مولانا نے اختلاف کیا ہو؟

نعمانی صاحب! مولانا محترم، آخری عمر میں طلباء و اساتذہ اور بالخصوص نوجوان نسل سے بہت پُر امید تھے۔ اس بارے میں کبھی نجی تاثرات بھی دیتے تھے؟

طلباء و اساتذہ کے بارے میں مولانا کے تاثرات بہت بالخصوص اسلامی جمعیت طلبہ کے نوجوانوں سے انہیں بہت محبت تھی اور چونکہ اساتذہ بھی فکری محاذ کی فوج ہیں، اسلئے ان سے بھی محبت تھی۔ اسلامی جمعیت طلباء کے نوجوانوں کو اپنے بچوں کی طرح عزیز سمجھتے تھے۔ جس طرح بچے ضد کر کے باپ کے ذوق کے خلاف بھی بعض باتیں منوا لیتے ہیں اسی طرح کا رویہ جمعیت کے نوجوان بھی اختیار کرتے اور دوسری طرف ایک شفیق باپ کی شفقت بھی ہنستی مسکراتی دکھائی دیتی۔ ایک مرتبہ پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کا پورا پینل انتخاب میں کامیاب ہوا (شاید اس انتخاب میں لیاقت بلوچ صاحب صدر منتخب ہوئے تھے) طلباء کامیابی کا جلوس لے کر مولانا کے گھر پہنچے اور مبارکباد کے ساتھ ہی مٹھائی کا مطالبہ کیا۔

مولانا نے فرمایا! "کھانا تو جتنی کھانی ہے، لیکن خیال رہے کہ جن کو آپ ہوسٹلوں میں چھوڑ آئے ہیں وہ کہیں رہ نہ جائیں۔" چنانچہ یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ پھیلتے پھیلتے منوں تک جا پہنچا۔ مولانا نے اس موقع پر چار ہزار روپے مٹھائی کا بل ادا کیا۔ اس طرح نوجوانوں کے لئے اسلامی لٹریچر کی ضرورت درپیش ہوتی تو مولانا پوری فرما دیتے۔ مولانا محترم جمعیت طلباء کی دینی، علمی اور تبلیغی کوششوں سے بڑے متاثر تھے۔

ایک صاحب نے مولانا محترم کو چالیس ہزار روپے کی رقم بھجوائی اور مولانا کو یہ اختیار دیا کہ وہ اسے کسی نیک کام میں خرچ کر دیں، چنانچہ مولانا نے یہ رقم جمعیت طلبہ کے تبلیغی

خدمت میں دے دی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا محترم اسلامی جمیعت طلبہ کے نوجوانوں کو دینی لحاظ سے کس مقام پر فائز دیکھتے تھے۔

مولانا محترم دن رات میں کتنا اور کتنی دیر کام کرتے تھے؟

مولانا نے اپنی زندگی میں ایک پورا رمضان یوں گزارا کہ نماز تراویح پڑھ کر بیٹھتے تھے اور کام کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ گھر والے آکر کہتے: "سحری تیار ہے"۔ میں نے اوسطاً مولانا کو ۱۹ گھنٹے مسلسل کام کرتے دیکھا ہے۔

ارباب اختیار سے ملتے ہوئے مولانا کا رویہ کیا ہوتا تھا؟

مولانا کو ایسے موقعوں پر نہ تو مرعوبیت کا احساس ہوتا نہ تفاخر کا! بلکہ بڑے ہی معتدل و متوازن انداز میں ملتے تھے۔ سابق صدر ایوب خان سے دو دفعہ گورنر ہاؤس لاہور میں (ایوب خان کی خواہش پر) ملے تھے اور تین دفعہ پنڈی میں ملاقات کی تھی! البتہ صاحبانِ اقتدار کے بجائے صاحبانِ علم و فضل سے ملتے وقت مولانا کا رویہ منکسرانہ و مشفقانہ ہوتا۔ ان صاحبانِ دین و دانش میں مفتی اعظم مولانا مفتی امین الحسینی صاحب، امام کعبہ محترم عبداللہ بن سبیل، مولانا محمد چراغ صاحب، مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل، مولانا معین الدین صاحب، مولانا ادریس صاحب کاندھلوی وغیرہ حضرات شامل ہیں۔

مولانا محترم کا مولانا امین حسن صاحب اصلاحی سے رویہ کیسا تھا؟

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے مولانا محترم کا تعلق ہمیشہ سے بزرگانہ رہا اگرچہ وہ جماعت (جماعتِ اسلامی) چھوڑ چکے تھے، تاہم مولانا ان کا احترام کرتے تھے۔ جب مولانا اصلاحی کے صاحبزادے ابو صالح اصلاحی صاحب (جو صحافی تھے) کا قاہرہ کے حادثے میں انتقال ہوا تو مولانا محترم تعزیت کے لئے اصلاحی صاحب کے گھر تشریف لے گئے۔ یہ مولانا محترم کی اصلاحی صاحب سے (جماعت چھوڑنے کے بعد) پہلی ملاقات تھی۔ امریکہ جانے سے چند ماہ قبل مولانا اصلاحی صاحب نے ملاقات کی خواہش فرمائی۔ جب اس کا ذکر مولانا محترم سے کیا گیا تو آپ نے فرمایا: "بڑی خوشی سے جب چاہیں تشریف لائیں!" چنانچہ امریکہ روانگی سے دو دن پہلے ملاقات طے پائی۔ مگر افسوس کہ عین اس وقت مولانا کی طبیعت غیر معمولی طور پر علیل ہو گئی۔ اس لئے مولانا اصلاحی صاحب سے عرض کیا گیا کہ وہ زحمت نہ فرمائیں۔

نعمانی صاحب! مولانا محترم کی زندگی صدموں بھری زندگی ہے۔ آپ نے ایسے صدموں سے گزرتے ہوئے مولانا کو کس حال میں پایا ہے؟

بڑا ہی صابر و شاکر! مولانا مسعود عالم ندوی سے لیکر چودھری غلام محمد مرحوم، سردار علی خان مرحوم، مولانا عبدالعزیز مرحوم اور ڈاکٹر نذیر شہید تک جتنے بھی ساتھیوں کا ساتھ ٹوٹا مولانا کے لئے جانکاہ صدمہ ثابت ہوا۔ اسی حال میں مشرقی پاکستان کا سقوط مولانا کے لئے دلخراش سانحہ ہی نہ تھا بلکہ ان کی جدوجہد کے لئے ایک ہمت شکن مرحلہ بھی تھا۔ مگر ان سارے مراحل سے گزرتے ہوئے مولانا محترم نے اپنے اللہ کی مشیت سے کبھی جنگ نہ کی بلکہ وہ راضی برضا صبر و سکون کا دامن تھامے رہے! البتہ میں نے اخوان المسلمون کے رہنماؤں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے دوران مولانا کی حالت بہت غیر دیکھی ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد ہے کہ جب سید قطب شہید کی شہادت کی خبر آئی تو خلاف معمول مولانا محترم کی آنکھ میں آنسو تیر گئے۔ مشرقی پاکستان کے سانحہ سے قبل مولانا محترم نے قوم کو انتباہ کیا تھا "غلط سطح پر جب بھی مخلوط انتخابات ہوں گے، مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر منتج ہوں گے"۔ چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ مخلوط انتخابات نے دنیا کی عظیم ترین اسلامی ریاست کے ٹکڑے کر دیئے۔ بہرحال مولانا ہر حال میں خوش رہنے والے انسان تھے۔ عام آدمی سی زندگی بھر

(بقیہ مولانا کے دیرینہ خدمت گار [illegible] کے آخر میں ملاحظہ فرمائیے)

مولانا کے دیرینہ خدمتگار محمد حنیف سے ملاقات

اس سوگوار فضا اور ماتمی ماحول میں ہر فرد بشر اس لائق تھا کہ اس سے تعزیت کی جاتی وہ عزاداروں کی مجلس تھی۔ ہر ایک، ایک دوسرے کے غم میں شریک تھا اور یوں اپنا غم شمار رہا تھا۔ رونے والے رو رو کر ہلکان ہو رہے تھے۔ کہیں صبر و شکر کی نصیحت آتی تو کہیں گلے سے گلا سینے سے سینہ ملتا۔ افسردگی کے یہ مناظر آنکھوں میں جذب ہوتی تو آنکھوں کو جھیل بنا دیتے۔۔۔۔ ہر طرف آہوں، آنسوؤں اور سسکیوں کا غبار تھا۔ اس پُر نم فضا میں ایک آنکھ خشک بھی تھی۔ میں دو دن سے مسلسل اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جوان سال، گم صم ہر طرف دیکھتا ہے۔ اس کے دل میں اُبال آتا ہے۔ لیکن پلکوں کی دہلیز پہ کوئی ایسی کشیدہ نہیں کہ قطرۂ آب کہیں جمے۔۔۔۔ اشک نمناک کہیں جمے! میں چشم حیرت سے دیکھتا ہوں اور اس کے قریب جاتا ہوں۔۔۔۔ وہ دور ہٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے اس کا یوں کھڑا ہونا، ادب و عقیدت سے ماخوذ ہوتا ہے۔ میں کچھ اور آگے جاتا ہوں تو وہ منہ پھیر لیتا ہے وہ کچھ چھپانا چاہتا ہے۔ میں اس موقع پر پیچھے ہٹ جاتا ہوں میں نہیں چاہتا کہ وہ زندگی کے جس ورق کو مستور رکھنا چاہتا ہے اسے عریاں کر دوں۔ لیکن اب تک اس کی ہر ہر ادا میرے ذہن میں کھبتی چلی گئی ہے۔ میرے دل میں اترتی چلی گئی ہے۔۔۔۔ اب میرے تجسس میں تشویش کا آہنگ بھی در آیا ہے یہ نوجوان آخر ہے کون؟

اتنے میں میں ایک نشست کا سہارا لیتا ہوں۔ سلیم منصور خالد صاحب میری طرف بڑھتے ہیں، وہ مجھے دیکھتے ہی ایک سمت اشارہ کرتے ہیں۔ ان کی اٹھتی ہوئی انگلی کی جانب میری نگاہ و نظر گردش کرتی ہے اور پھر میں کچھ فاصلے پر اسی نوجوان کو دیکھتا ہوں، جو سوگوار بھی ہیں ماتم زار بھی ہے۔۔۔۔ افسردہ بھی ہے۔۔۔۔ غمزدہ بھی ہے۔۔۔۔ اور میرے لئے غم کی یہ تصویر اپنی جگہ ایک معمہ بھی ہے۔۔۔۔ سلیم صاحب میرے قریب آن کر بیٹھ جاتے ہیں۔۔۔۔ "ملے ہیں ان سے" وہ پوچھتے ہیں تو میں کہتا ہوں:

"کون ہیں یہ؟"

"یہ سیّد کے خادم خاص ہیں۔ جو سالہا سال تک اُن کی خدمت کرتے رہے ہیں۔"

"ان کا نام؟"

"محمد حنیف ان کا نام ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی سلیم صاحب اس نوجوان کو اشارہ کرتے ہیں، وہ لپک کر آگے بڑھتا ہے۔

جس خادم کو جناب سیّد کی خدمت میں دو دہائیاں رہنے کی سعادت حاصل ہے، اسے آتے دیکھ کر میں بھی ان کی خدمت میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔ بے اختیار میرا ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ میری بے چارگی و بے سہارگی کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ قریب کی ایک نشست سنبھال لیتا ہے۔ ابھی تک اسکی زبان خاموش اور اس کی آنکھوں میں پہلے کی سی ویرانی ہے۔ میں اس اداس کیفیت سے پوچھتا ہوں:

"حنیف صاحب! یہ کوئی انہونا واقعہ نہیں، یہ تو ہم سب کی جانی پہچانی راہ ہے۔۔۔۔ پھر آپ اتنے خموش کیوں ہو؟"

"میں نے زندگی کے بیس سال اس جانِ مہربان کے قریب رہ کر گزارے ہیں۔ میرا سرمایہ وہی ہیں۔ آج اس سرمایہ سے محروم ہو کر اپنے نقصان کا اندازہ کرتا ہوں تو ملکوت ہی میں سکون نظر آتا ہے۔۔۔۔ یوں اس

کے دل کا اضطراب زبان پہ آجاتا ہے، پھر وہ ادھر اُدھر دیکھتا ہے اور کچھ دور اسے دھندلے نقوش نظر آتے ہیں۔ یہ نیم جاں نقش اس کے ماضی کی تصویر ہیں۔

پھر وہ سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے اور جناب سیّد سے اپنی طویل رفاقت کا باب کھولتا ہے:۔

"میں ۱۴ اگست ۱۹۵۸ء میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ چودھری عبدالغنی گھمن صاحب مجھے ساتھ لیکر آئے تھے۔ میں ان کے ہمراہ مولانا کی خدمت میں لے جایا گیا۔ میں نے سلام کیا۔ مولانا نے "وعلیکم السلام" کہہ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ اس وقت میں بچہ تھا۔ مولانا محترم نے مجھ سے ایک دو سوال کئے اور پھر فرمایا!

"بیٹا آپ کو چھوٹے موٹے کام کرنے ہوں گے"

اگلے روز سے میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ بازار سے سبزی لانا، گھر کی صفائی کرنا، مہمانوں کی خدمت، یہ سب میری سعادتوں کے بکھرے بکھرے عنوان ہیں۔ میں ٹھیک ایک ماہ تک بڑے آرام و اطمینان سے اپنا کام کرتا رہا۔ ایک دن اچانک مولانا کے صاحبزادے محمد فاروق صاحب سے میری لڑائی ہو گئی ...... مجھے صحیح طور پر یاد نہیں کہ کس معاملہ پر جھگڑا ہوا تھا ..... وہ اس وقت نویں یا دسویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ میں احتجاجاً کسی کو بتائے بغیر کام چھوڑ کر گھر واپس چلا گیا۔ چوہدری عبدالغنی صاحب کو پتہ چلا تو وہ دوبارہ مجھے منا کر مولانا کے پاس لائے۔ مولانا صاحب نے بڑی شفقت سے پوچھا:

"بیٹا کیا ہوا تھا؟"

میں نے سارا واقعہ عرض کر دیا۔ مولانا نے یقین دلایا کہ آئندہ آپ سے کوئی بھی جھگڑا نہیں کرے گا۔ ان کا لہجہ اس قدر مشفقانہ تھا کہ میں سب کچھ بھول کر دوبارہ اسی طرح کام میں جُت گیا جیسے پہلے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ بہرحال اس واقعہ نے محمد فاروق صاحب کو میرا حریف بنا دیا وہ اکثر مجھے چھیڑ کر خوش ہوتے۔ میں کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لایا۔

ایک دن میں گھر کی صفائی کر رہا تھا کہ محمد فاروق صاحب آئے اور میرے ہاتھ سے "ڈسٹر" چھین کر دور پھینک دیا مجھے بہت افسوس ہوا لیکن میں نے دل میں عہد کیا تھا کہ کسی سے شکایت نہ کروں گا

یہ سب کچھ امی جان (بیگم مودودی) دیکھ رہی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے ابا جان (مولانا مودودی) سے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ رات کے کھانے پر ہم سب جمع ہوئے محمد فاروق صاحب بھی بیٹھے تھے۔ ابا جان نے فاروق صاحب سے پوچھا کہ محمد حنیف سے کیوں شرارت کی تھی؟ فاروق صاحب جو طبعاً شوخ واقع ہوئے تھے اسنے جواب میں کہہ دیا۔ "ٹھیک کیا ہے"۔ اس پر ابا جان نے پاؤں سے جوتا نکال کر فاروق صاحب کے سر پر دے مارا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ سارا واقعہ امی جان نے ابا جان کو بتایا تھا۔ ابا جان کو غصہ بہت کم آتا تھا۔ لیکن کوئی عام آدمی ان کے شدید غصہ کے عالم کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ میرے ۲۰ سالہ زندگی کے دور میں ابا جان نے کبھی غصہ کیا نہ شکایت۔

ایک مرتبہ میرے ہاتھ سے پانی کا گلاس چھوٹ گیا وہ گرا تو ابا جان کے کئی تازہ مسودات بھی بھیگ گئے ابا جان نے صرف اتنا کہا: "بیٹے ذرا سنبھال کے"۔ ابا جان کی زبان سے کبھی ہلکی بات نہ نکلی تھی۔ وہ بچوں کو انتہائی سختی سے ڈانٹتے، تو یہ کلمہ کہتے: "اللہ کے بندے ایسی بات مت کیا کرو"۔ میں نے زندگی کے ۳۰ سال گزارے ہیں، ابا جان نے اس جملہ سے بڑھ کر کوئی بات منہ سے نہیں نکالی تھی۔ دراصل ابا جان بہت صابر و شاکر انسان تھے، ان کے دل میں محبت بے کراں تھی۔ میں نے صبر و شکر اور محبت و عقیدت کی انتہا کا ۱۹۵۹ء میں اس وقت

مشاہدہ کیا جب ابا جان کی والدہ کا انتقال ہوا۔ ابا جان کو اپنی والدہ سے بے پناہ محبت تھی۔ میں سوچا کرتا تھا جس روز ابا جان کی محبوب ماں نہ رہیں، اس روز نہ جانے ابا جان کا کیا حال ہوگا؟ ابا جان جب بھی باہر سے آتے سیدھے اپنی والدہ کے پاس جاتے ان کی خیریت پوچھتے۔ والدہ صاحبہ کو اپنے دونوں بیٹوں سے پیار تھا چنانچہ وہ آخری عمر میں اچھرہ سے منتقل ہو کر اپنے بڑے صاحبزادے مولانا ابوالخیر صاحب مودودی کے ہاں چلی گئیں۔ ابا جان نے والدہ کو بہت روکا، مگر وہ نہ مانیں۔ پھر ابا جان کا معمول بن گیا کہ عام حالات میں ہفتے میں ایک بار اور بیماری کے ایام میں دوسرے تیسرے دن اپنی والدہ کے ہاں جاتے۔ جب ان کا انتقال ہوا، تو ابا جان کو بہت صدمہ ہوا، لیکن مجھے اس روز معلوم ہوا کہ ابا جان کی محبت فطرت سمجھ اور ہوش و خرد سے آزاد نہیں۔ میں نے چند لمحوں کے لئے ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور پھر صبر و شکر کی تصویر پایا۔ ایک ایسا موقع اور بھی آیا، جب پاکستان تقسیم کر دیا گیا۔ اس وقت بھی میں نے ابا جان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے، لیکن چند لمحوں کے بعد میں نے دیکھا کہ یہ حزن و یاس نہیں رہا، بلکہ ہر آنے والے کیلئے ابا جان ہی امید کی کرن دکھائی دے رہے تھے۔ تھوڑے عرصہ بعد ڈاکٹر نذیر شہید کا سانحہ پیش آیا۔ تو ابا جان بہت مغموم ہو گئے انہوں نے فرمایا: "آج میں اپنے ایک دوست اور جماعت کے قریبی ساتھی سے محروم ہو گیا ہوں۔"

ابا جان کسی سے زیادتی نہ کرتے تھے، حتیٰ کہ وہ پولیس والوں سے بھی کبھی سختی سے بات نہ کرتے تھے۔ یاد ہے کہ وہ ۶۵-۱۹۶۴ء میں ایک دفعہ پولیس کوئی ڈیڑھ بجے آن دھمکی۔ ہم ابا جان کے دفتر کے پہلو میں واقع ایک چھوٹے سے کمرے میں دراز پڑے تھے ہمارے ساتھ ایک لڑکا غلام محمد نامی بھی مقیم تھا۔ پولیس نے آن کر دستک دی تو میں نے دروازہ کھولا، انھوں نے پوچھا "تمہارا نام؟" میں نے کہا، "محمد حنیف" دوسرے کا کیا نام ہے۔ اس نے کہا: "غلام محمد" پولیس کے ایک آدمی نے فوراً کہا: "غلام محمد کراچی والے" اور ہم سب ہنس پڑے۔ یہ لوگ ہمیں اٹھا کر ابا جان کے پاس کمرے میں لے آئے وہاں پولیس کے اعلیٰ حکام بیٹھے تھے۔ ابا جان نماز فجر کی اجازت مانگ کر نماز ادا کر رہے تھے۔ پولیس والے ان کا بستر، اچکن، قمیص اور ضرورت کا سامان اٹھا اٹھا کر جیپ میں رکھ رہے تھے۔ جب سب کچھ تیار ہو گیا تو ابا جان ہنستے مسکراتے باہر آئے اور فرمایا چلئے۔ اس وقت ان کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا۔ پولیس والے پورے احترام کے ساتھ انھیں لے کر گئے پہلے انھیں جیپ میں بٹھایا اور پھر خود بیٹھے۔ ابا جان کے تعلقات اپنی بے پناہ مصروفیات کے مقابلہ میں بہت وسیع تھے۔ سیاست دانوں میں ممتاز دولتانہ صاحب، نوابزادہ نصر اللہ خاں، ملک قاسم صاحب، سردار عبدالقیوم خان اور چوہدری محمد علی صاحب سے مراسم تھے۔ صحافیوں میں آغا شورش کاشمیری مرحوم سے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ ان کے علاوہ مصطفےٰ صادق صاحب، الطاف حسن قریشی صاحب اور مجیب الرحمٰن شامی صاحب سے بھی مراسم تھے۔

بعض سیاست دان ابا جان سے دور رہتے تھے اس لئے ان سے ملنا کم ہوتا تھا۔ میری موجودگی میں خان عبدالولی خان صاحب تین مرتبہ ابا جان سے ملنے تشریف لائے ابا جان بڑی کشادہ دلی کے ساتھ گھنٹوں ان سے باتیں کرتے رہے۔ میں نے ابا جان کو اور خان صاحب کو کئی دفعہ خاصی خاصی دیر تک ہنستے سنا۔ میری موجودگی میں غالباً ۱۹۷۳ء میں ایک مرتبہ خان صاحب کے والد خان عبدالغفار خان صاحب ملنے تشریف لائے۔ ابا جان ان کے استقبال کے لئے کمرے سے باہر آئے اور ان کو اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ ان دنوں بھی ابا جان کی صحت غیر معمولی طور پر کمزور

تھی۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے خان صاحب کا پورے
پورے احترام کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر ابا جان
نے خان صاحب کیلئے بہت سا پھل منگوایا تھا جس
میں سیب اور کیلا مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ملاقات ختم ہوئی
تو ابا جان دوبارہ کمرے سے باہر آئے اور پورچ تک خان
صاحب کو خود چل کر رخصت کیا۔ میں نے ۲۰ سالہ خدمت
کے دوران میں یہ سلوک محبت و عقیدت کا سلوک کسی
سے ہوتا نہ دیکھا تھا ہاں مفتی اعظم مولانا امین الحسینی جب
تشریف لاتے تو ابا جان کو ان سے یہ سلوک کرتے دیکھا
یا پھر خان عبدالغفار خان صاحب سے اس سلوک
کا مظاہرہ ہوتے دیکھا۔

ابا جان کی مہربانیاں اور کرم فرمائیاں ہر خاص
و عام کے لئے عام تھیں، وہ میرے ذاتی معاملات میں بھی
دلچسپی لیتے تھے۔ یہ غالباً ستمبر ۱۹۷۲ء کی بات ہے۔ میری
شادی ہوئی تو میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ ابا جان کو
ولیمہ میں شرکت کی دعوت دی۔ انھوں نے قبول فرمائی
اور ولیمہ میں بنفس نفیس تشریف لائے اس موقع پر
مجھے ۲۰۰/- روپے بھی عنایت فرمائے۔ میں نے اس سارے
عرصے میں کبھی ابا جان کو کسی کی "سفارش" کرتے نہ دیکھا
تھا۔ میرے عزیز رشتہ دار مجھے بہت "تنگ" کرتے تھے کہ فلاں
کام میں مولانا سے سفارش کروا دو۔ فلاں معاملے میں
سفارش کروا دو! مگر ہر بار میں انہیں یہی جواب دیتا
جو شخص اپنے بیٹوں کے حق میں سفارش کرنا پسند نہیں
کرتا، اسے میں اپنے عزیزوں کی خاطر کیوں بے اصول بناؤں!
ابا جان کو نوجوانوں سے بہت محبت تھی۔ میں پرائمری تک
تعلیم یافتہ ہوں، علم و فکر کی اس درگاہ سے وابستگی
کے بعد بہت کچھ سیکھا ہے، پھر بھی اہم سیاسی معاملات
میں میری رائے عالمانہ و طالب علمانہ، تو کیا "بچکانہ"
بھی نہیں کہی جا سکتی۔ اس کے باوجود میں اپنے مشاہدے
کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ابا جان جماعت (جماعت اسلامی)
کے مقابلہ میں جمعیت (اسلامی جمعیت طلبہ) کو کسی طرح بھی
کم نہیں سمجھتے تھے۔ آج سوگ و ماتم کا دن ہے تو ان کی ساری
مہربانیاں زندہ ہو گئی ہیں۔ ان کی مشفقانہ ادائیں یوں
لگتا ہے جیسے وہ مجھ پر واجب الادا قرض بن گئی ہیں۔ میں
نے ساری گفتگو میں عالم اسلام اس امام اعظم کو "ابا جان"
کہہ کر مخاطب کیا۔ میں کسی طور پر بھی اس لائق نہیں ہوں
کہ عظمتوں کی فرزندگی میں حصہ دار ہوں۔ یہ بھی ابا جان کی
شفقت ہے کہ انہوں نے زندگی بھر مجھے "بیٹا" کہہ کر مخاطب کیا
اور آج میری زبان بھی، میرا ذہن بھی، میرا قلب حزیں بھی
انہیں "ابا جان" کہہ رہا ہے۔ میں ابا جان کے لئے کوئی دعا نہیں
کر سکتا۔ میں تو خود آج بھی ان کی دعاؤں کا محتاج ہوں۔

(بقیہ عاصم نعمانی کا انٹرویو)

انھیں کبھی پریشان نہ دیکھا، بلکہ ان کے پاس غمزدہ افراد
آتے تھے اور اپنا غم جھاڑ کر جاتے تھے۔ مولانا محترم کو اسلامی
جمعیت طلبا، کی کامیابیوں سے بڑی خوشی ہوتی تھی۔

نعمانی صاحب! آپ نے کبھی مولانا کو کسی نوع کی شکایت بھی پیدا
ہوتی؟

مولانا محترم نے کبھی بھی کسی شکایت کا اظہار نہیں فرمایا!
یہ زندگی بھر ان کی عادت نہیں رہی۔ مولانا محترم آپ کو کس
طرح مخاطب فرماتے؟ میری غیر موجودگی میں مجھے بلانا ہوتا "کو ملک
صاحب کہہ کر مخاطب کرتے۔ میری موجودگی میں تخاطب فرماتے تو
آپ سے مخاطب کرتے جس سے مجھے بڑی ندامت ہوتی۔ نعمانی صاحب
آپ جامع الصفات اور جامع الحیثیات شخصیت کے اٹھ جانے کے بعد آپ
کے کیا تاثرات ہیں؟ مجھ غمزدہ کا پہلا تاثر یہ ہے کہ دین کا کام بہرحال
افراد سے وابستہ نہیں۔ مولانا محترم جس نئی راہ پر رواں ہوئے ہیں وہ
اسلاف اور اخلاف ہر دو کی راہ ہے ایک نہ ایک دن ہمیں بھی
جانا ہے۔ ہماری غمزدگی بطفیل عقیدت ہے، اور یہ عقیدت باعث
فلاح ہے۔ اگر ہم مولانا مودودی کو ان کے حیات آفریں اور مرگ
نا آشنا مشن کے حوالے سے زندہ جاوید بنا سکیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

نوابزادہ نصراللہ خان غازی

سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جمہوریت کیلئے انکی جدوجہد

قیامِ پاکستان کے بعد مختلف مواقع ایسے آئے کہ مجھے مولانا مودودی سے ملنے کا اتفاق ہوا بالخصوص ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء لگنے سے پیشتر ہم ایک کانفرنس میں شریک ہوئے وہاں مولانا موجود تھے۔ مختلف سیاسی امور، مجوزہ انتخابات کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ مولانا سیاسی معاملات کے بارے میں بڑی صاف اور گہری سوچ رکھتے ہیں اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے اس کے کچھ عرصہ بعد مشرقی پاکستان کے نو رہنماؤں LEADERS NINE کا بیان آیا جس میں ایوب خان کے آئین کو مسترد کیا گیا تھا اور اپنی طرف سے کچھ تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اگر مشرقی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں نے الگ سوچ کی بنیاد پر آئین کو تبدیل کرنے کی کوشش کی اور ان کے ساتھ مغربی پاکستان کے رہنما شامل نہ ہوئے تو لازماً اس سے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے رہنماؤں کی سوچ میں فرق پیدا ہوگا۔ جو ملک کی سالمیت کے تقاضوں کے خلاف ہوگا اس کے بعد میں مولانا سے ملا۔ اپنے خدشات کا اظہار کیا یہ بھی کہا کہ میں مشرقی پاکستان جاؤں اور ان رہنماؤں سے ملوں جنہوں نے بالآخر اپنے آپ کو این ڈی ایف کی صورت میں تنظیم کی شکل دے دی تھی۔ یہ فیصلہ کیا تھا کہ الگ الگ سیاسی جماعتیں بحال نہ کریں گے تاکہ اس ملک میں جمہوریت بحال نہ ہو جائے میں وہاں گیا اور جس طرح مولانا کے ساتھ مشورہ ہوا تھا۔ انہی خطوط پر کام کیا۔ ان قائدین کو اس بات پر آمادہ کر لیا۔ کہ بجائے اس کے کہ وہ اس تحریک کو مشرقی پاکستان تک محدود رکھیں۔ اس میں مغربی پاکستان کے رہنماؤں کو اپنے ساتھ شامل کریں۔ اور بنیادی مطالبہ یہ ہونا چاہیئے کہ ۱۹۵۶ء کا آئین جو مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے نمائندوں نے متفقہ طور پر ملک کو دیا تھا اسے دوبارہ بحال کیا جائے کیونکہ سکندر مرزا اور ایوب خان کو اسے ختم کرنے کا کوئی آئینی اور قانونی حق نہیں تھا۔

اسی کی بنیاد پر یہ طے ہوا کہ مشرقی پاکستان

کے رہنما مغربی پاکستان کا دورہ کریں گے۔ اس وقت تک حسین شہید سہروردی مرحوم رہا ہو گئے جو نظر بند تھے وہ ان رہنماؤں کو لے کر مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان پہنچے اور یہاں لاہور میں ہمارے اجلاس محمد علی قصوری کی رہائش گاہ پر ہوتے تھے جن میں مولانا مودودی بالالتزام شریک ہوا کرتے تھے اور اس تحریک کے جمہوری مقاصد کے سلسلے میں ۱۹۵۶ کے آئین کی بحالی کے بارے میں ان کی سوچ بالکل واضح تھی اور میں نے کبھی بھی ایسا موقع نہیں دیکھا جس میں مولانا نے ایسا موقف اختیار کیا ہو جو دوسرے جمہوریت پسند سیاستدانوں کے نزدیک ناقابل قبول ہو منطقی طور پر بھی وہ اپنی رائے کو مدلل طریق سے پیش کرتے تھے اور اس کا انداز بیان جذباتیت سے بالکل الگ تھا۔ اور وہ خالص دلائل کی بنیاد پر اپنے ساتھیوں اور رفقاء کو قائل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

بالآخر یہ طے ہوا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے سیاستدان مل کر تحریک چلائیں۔ مسلم لیگ نیپ عوامی لیگ اور جماعت اسلامی ان سب کے قائدین شریک ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ آزاد سیاستدانوں نے بھی ہمارے ساتھ تعاون کیا۔ اس دوران مغربی پاکستان کے دورہ کا پروگرام بنایا گیا۔ اور مولانا مودودی کی ہدایت پر جماعت اسلامی کے اکابر بھی ہمارے ساتھ شریک رہے۔ بعد ازاں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ حسین شہید سہروردی صاحب بیماری کی وجہ سے ہسپتال میں داخل تھے۔ ہماری میٹنگ ملکہ ہاؤس میں ہوئی مولانا کی ہدایت پر میاں طفیل اور جماعت کے لیڈر بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔ اس موقع پر جو قرارداد مرتب کی گئی اس کی بنیاد پر ہمارے خلاف بغاوت کا مقدمہ درج کیا گیا کچھ عرصہ بعد ہمیں نظر بند بھی کر دیا گیا اور یہ مقدمہ کئی سال تک چلتا رہا۔ جب سہروردی مرحوم بیماری کی وجہ سے بیروت میں قیام کر رہے تھے۔ اور ہمارے خلاف بغاوت کا مقدمہ جاری تھا۔ تو اس دوران ایک مرتبہ میاں محمد علی قصوری کے مقام پر مولانا مودودی میاں ممتاز دولتانہ اور میاں محمود علی قصوری شامل تھے۔ یہ طے ہوا کہ میں بیروت جاؤں اور میں جا کر سہروردی صاحب کو آمادہ کروں کہ وہ بیماری کے باوجود پاکستان آئیں۔ اور مشرقی پاکستان سے تحریک کا آغاز کریں جس چیز کو تحریک کی بنیاد بنانا تھا۔ وہ تھا۔ ایک آرڈیننس کا اجرا جس کے ذریعے ایبڈو زدہ سیاستدانوں پر یہ پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ کہ وہ نہ تو کوئی بیان دے سکتے ہیں اور نہ رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اس آرڈیننس کی خلاف ورزی کا فیصلہ کیا گیا جس کا آغاز مشرقی پاکستان سے کرنے کے لئے تمام اصحاب علی الخصوص مولانا مودودی نے رائے دی تھی۔ چنانچہ اس مشورہ کی بنیاد پر میں نے بغاوت کے مقدمہ کے دوران درخواست دی کہ مجھے قانونی مشورہ کرنے کے لیے بیروت جانا ہے چنانچہ اس بنا پر میں نے عدالت میں حاضری سے مستثنیٰ قرار دیئے جانے کی اجازت حاصل کی اور میں بیروت گیا بیروت جا کر میں نے سہروردی صاحب سے طے کرا لیا اور پاکستان پہنچنے کی تاریخ مقرر ہو گئی جس پر کراچی پاکستان پہنچنا تھا پھر کراچی سے ڈھاکہ اور ڈھاکہ سے جہاں سے ایک عظیم الشان جلسہ عام میں اس آرڈیننس کی خلاف ورزی کا آغاز ہوتا۔ اس دوران راجہ صاحب محمود آباد وہاں (بیروت) پہنچے اور انہوں نے اپنی طرف سے سہروردی کو باز رکھنے کی پوری کوشش کی جب میں واپس آیا تو میں نے وہاں سے سہروردی صاحب کا خط مولانا مودودی اور قصوری صاحب کے نام لکھا۔ یہ بات اس بنا پر پوری نہ ہو سکی کہ سہروردی صاحب کچھ دنوں کے بعد بیروت میں وفات

پا گئے اس کے بعد بحالی جمہوریت کی تحریک کو خاصا نقصان پہنچا۔

کچھ عرصہ کے بعد ہم نے از سرِ نو کوشش شروع کی کہ سیاسی عناصر کا دوبارہ اتحاد ہو۔ لیکن بدقسمتی سے خواجہ ناظم الدین مرحوم کی سوچ ابتدا میں یہ تھی کہ مسلم لیگ تنہا اس آمریت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور انہیں کسی کیسا تھ تعاون نہیں کرنا ہے۔ حالانکہ ان کے صدر بننے سے پیشتر میاں ممتاز محمد خان دولتانہ سردار خان یوسف خٹک یہ تمام حضرات ہمارے ساتھ مکمل تعاون کر رہے تھے لیکن خواجہ صاحب کی اس پالیسی کی وجہ سے ہمارے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ اور وہ جو مشرقی پاکستان مغربی پاکستان نے مل کر بحالی جمہوریت کی تحریک کے لیے جدوجہد کرنے کا سوال تھا۔ معلق ہو گیا۔

جماعت اسلامی کو اس دوران خلاف قانون قرار دے دیا تھا۔ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے دیگر اکابرین جیلوں میں بند تھے۔ لیکن اس کے باوجود مغربی پاکستان میں NDF قائم کیا گیا۔ اس میں جماعت اسلامی کے نمائندے بھی ہمارے ساتھ شریک تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی مولانا مودودی کی ہدایات کے بغیر ایسا نہیں کر سکتے تھے انہوں نے مولانا کی مرضی کے مطابق ہمارے ساتھ شریک ہوئے مغربی پاکستان میں این ڈی ایف کا میں کنوینر تھا مشرقی پاکستان میں نورالامین مرحوم کنوینر تھے جب صدارتی انتخابات کا اعلان کیا گیا تو خواجہ ناظم الدین نے مجھے خط لکھا کہ وہ میرے ساتھ مشورہ کرنا چاہتے تھے میں راولپنڈی میں تھا۔ اور خواجہ صاحب لاہور پہنچے ہوئے تھے میں لاہور آیا ان کے ساتھ بات ہوئی ہم شروع سے اس بات کا اظہار کرتے رہے تھے۔ کہ مسلم لیگ کو ہمارے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ جب ان کی طرف سے اس بات کا اظہار ہوا کہ وہ بھی صدارتی انتخاب میں باقی سیاسی جماعتوں اور سیاسی عناصر کے ساتھ تعاون کے ساتھ شریک ہونا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ مولانا نظر بند تھے پہلی میٹنگ ڈھاکہ میں جناب نورالامین کے گھر پر ہوئی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس اجلاس میں جماعت اسلامی کی طرف سے چوہدری رحمت الٰہی شریک ہوئے تھے۔ کیونکہ یہ جیل سے باہر تھے۔

ڈھاکہ میں ہم نے یہ طے کیا کہ دوسری میٹنگ کراچی میں ہو جس میں طے کیا جائے گا کہ ہماری طرف سے کون صدارتی امیدوار ہو۔ یہ وہ دور تھا۔ جب نیشنل اسمبلی میں وزیر قانون شیخ خورشید احمد نے یہ چیلنج دیا تھا کہ اُن کے پاس ایک امیدوار (ایوب خان مرحوم) کی صورت میں موجود ہے چونکہ حزب اختلاف منتشر ہے اس لیے وہ کسی امیدوار پر متفق نہیں ہو سکے گی عوام میں بھی سیاسی جمود تعطل اور پابندیوں کی وجہ سے کوئی جذبہ اُمنگ موجود نہ تھی۔

جب ہم کراچی میں اکٹھے ہوئے تو نیپ کے صدر مولانا عبدالحمید بھاشانی نے ہمارے لیے ایک بہت بڑی مشکل پیدا کر دی۔ وہ یہ تھی کہ اسی وقت حزب اختلاف کے سامنے دو نمایاں نام تھے ایک جنرل اعظم کا نام جن کی مشرقی پاکستان میں مقبولیت کی وجہ سے وہاں نمایاں کامیابی کے امکانات سامنے آتے تھے اور دوسرا نام مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کا نام تھا

مولانا بھاشانی اندر سے صدر ایوب خان کے ساتھ ملے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے اپنی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہم سے پہلے منعقد کیا اور اس میں یہ طے کر دیا کہ وہ کسی ایسے شخص کو صدارتی امیدوار کے طور پر قبول نہیں کریں گے جس کا تعلق مارشل لاء سے رہا ہو ظاہر ہے کہ اس سے وہ چاہتے تھے کہ جنرل اعظم خان کا CANDIDATURE ختم کر دیا جائے۔ اس طرح محترمہ فاطمہ جناح کا نام باقی رہ جاتا تھا۔ محترمہ کے بارے میں عمومًا یہ خیال تھا کہ عملی

سیاست سے بالعموم بالخصوص انتخابی سیاست میں حصہ لینا قبول نہیں کریں گی۔ یہ اس لیے کہا گیا کہ جنرل اعظم خان کا نام ختم کر دیا جائے تو دوسرے کسی نام پر حزب اختلاف کے لوگ متفق نہیں ہو سکیں گے

ہمارے لیے دوسری مشکل یہ تھی۔ کہ جہاں تک دینی حلقوں کا تعلق ہے وہ یہ سمجھتے تھے کہ ایک خاتون شریعت اسلامیہ کے مطابق سربراہ حکومت نہیں بن سکتیں تھیں ہمارے لیے یہ بڑا مشکل بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ جو مولانا بھاشانی کی اس پالیسی نے پیدا کر دیا اس کے بعد یہ طے ہوا کہ مولانا مودودی تک یہ بات پہنچائی جائے اگرچہ وہ جیل میں تھے تاکہ وہ اس سے عہدہ برآ ہونے کی سبیل نکالیں

مولانا نے پوری سنجیدگی کے ساتھ غور فرمایا اور جیل سے ہی جماعت اسلامی کے کارکنوں کو ہدایت کی موجودہ صورت میں ہمیں مادر ملت کے انتخابات میں تعاون کرنا چاہیے ہے کیونکہ ایوب کا ہٹانے کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔ مزید برآں ہمارے نو نکاتی پروگرام" میں بھی یہ تھا۔ کہ محترمہ کامیابی کے بعد صدارتی نظام کی جگہ پارلیمانی نظام حکومت نافذ کریں گی اس طرح سربراہ مملکت والا اعتراض بھی ختم ہو جاتا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں وہ محض آئینی سربراہ کی حیثیت اختیار کر جاتی تھیں۔ یوں مولانا مودودی کی بروقت سوچ کی وجہ سے ہم بڑے بحران سے بچ گئے بالآخر ہم نے متفقہ طور پر یہ طے کر دیا۔ کہ مادر ملت صدارتی امیدوار ہوں گی اس فیصلہ میں جماعت اسلامی اور چوہدری محمد علی کی قیادت میں نظام اسلام پارٹی بھی ہمارے ساتھ شریک تھی تو یہ دونوں جماعتیں اسلامی کے نفاذ کی داعی تھیں انہوں نے ہماری بھرپور تائید کی تھی۔

مولانا بھاشانی کے لیے اس کے باوجود ایک امید باقی تھی۔ کہ مادر ملت اس پیشکش کو قبول نہیں کریں گی۔ ہوا بھی یہی۔ مادر ملت نے بہت زیادہ تامل کے بعد ہمارے بے حد اصرار پر آمادہ ہو گئیں۔ اسی رات ہماری طرف سے پیش کش اور ان کی طرف سے قبول کرنے کا اعلان جاری کر دیا گیا۔ پورے ملک میں اس کا اثر ایسے ہوا جیسے بجلی رو جسم میں سرایت کر جاتی ہے۔ لیکن دوسرے دن مولانا بھاشانی نے ایک نئی مشکل یہ پیدا کرنے کی کوشش کی وہ اس طرح کہ ۹ نکات میں ایک نکتہ کو جس کا تعلق ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ سے تھا حذف کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں دھمکی دی کہ نیپ اپنے تعاون سے دست کش ہو جائے گی۔ یہ بھی بڑی تکلیف دہ صورت تھی خواجہ ناظم الدین چوہدری محمد علی جماعت اسلامی اور دیگر ساتھی بے حد پریشان تھے ہم نے مولانا بھاشانی سے استفسار کیا کہ آپ نے نو نکاتی فارمولا پر دستخط کیے تھے یا نہیں۔ تو انہوں نے تسلیم کیا کہ دستخط تو کیے تھے واقعہ یہ ہے کہ مولانا بھاشانی نے دستخط اس طرح کیے تھے کہ ان کا پورا نام انگریزی کاغذ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا تھا یہ بتایا گیا کہ دستخطوں کے بعد ہم اس مشکل میں کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ آپ اپنی پارٹی کو قائل کریں یا صدارت سے مستعفی ہو جائیں دراصل یہ نکتہ بھی مولانا بھاشانی نے اس لیے پیدا کیا تھا کہ مادر ملت کی طرف سے صدارتی امیدوار بن جانے کے بعد اگر اسلامی نظام کے نفاذ کے متعلق شق حذف کر دی جاتی تو تمام مخالف عناصر کو مادر ملت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کا موقع مل جاتا نیز جماعت اسلامی اور نظام اسلام جیسی جماعتوں کی حمایت سے بھی محروم ہونا پڑتا۔ بالآخر ہم نے انتخابات میں پوری طرح حصہ لیا۔ صدارتی انتخابات میں دھاندلی ہوئی اور ہمیں ہرا دیا گیا۔

صدارتی انتخابات کے بعد ہماری ایک میٹنگ کراچی میں ہوئی جس میں ہم نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کیا کیونکہ اجلاس میں مغربی پاکستان کے تقریباً تمام رہنما اور مشرقی پاکستان سے صرف شیخ مجیب الرحمٰن شریک ہوئے تھے کہ صدارتی

انتخاب میں دھاندلی کے بعد قومی اسمبلی کے انتخابات
میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ اور تحریک چلانی چاہیے کہ ہم
انتخابات کے نتائج کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہمیں یقین تھا کہ اس
وقت تک کوئی سمجھوتہ ہمارا نہیں ہوئی تھی جو محترمہ فاطمہ
جناح کو لگائی جا سکتی اور اگر ایوب خان کوئی ایسی صورت
پیدا کرتے تو اس کے نتائج ان کے لئے بے حد سنگین ہوتے
یہ بھی واقعہ ہے کہ جو تحریک ہمیں ۱۹۶۸ء تک چلانی پڑی وہ ختم ہو
جاتی اور اقتدار عوام کے نمائندوں کو منتقل کر دیا جاتا لیکن
اس مرحلہ پر بھی مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمٰن نے شدید
مشکلات پیدا کیں۔ اور ان کی طرف سے یہ اصرار ہوا کہ اجلاس
مشرقی پاکستان میں کیا جائے اور فیصلہ بھی وہیں کیا
جائے چنانچہ جب ہم ڈھاکہ پہنچے یہ اجلاس مولانا بھاشانی
کی صدارت ہوا مولانا بھاشانی نے یہ فیصلہ ہم پر مسلط کیا کہ
ہم قومی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیں گے ہم نے ان کا فیصلہ
اس لئے قبول کر لیا کہ ہم حزب مخالف کو علاقائی بنیاد پر حصوں
میں تقسیم کرنا چاہتے تھے ہم نے یہ قربانی قومی سالمیت کے
پیش نظر دی کیونکہ ہم دیانتداری کے ساتھ یہ سمجھتے تھے
کہ صدارتی انتخابات میں دھاندلی کے بعد قومی اسمبلی کے
انتخابات میں حصہ لینے کا جواز نہیں۔ اب یہ لوگوں کو معلوم
ہے کہ قومی اسمبلی کے انتخابات میں کس طرح دھاندلی کی
گئی۔

مولانا مودودی چوہدری محمد علی میں اور دیگر سیاستدانوں
نے پوری صورتحال کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر
پہنچے کہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دینا
چاہیے مشرقی پاکستان میں اس پر عمل نہ ہو سکا مشرقی
پاکستان میں صدارتی اور قومی اسمبلی کے انتخابات میں
دھاندلی کے خلاف احتجاج کے طور پر حصہ نہ لیا

اب اعلان تاشقند کا مسئلہ سامنے آیا۔ جنگ کے دوران
بھی ایک واقعہ رونما ہوا کہ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء سے ایک روز
پیشتر مولانا مودودی سردار شوکت حیات، چوہدری
محمد علی اور راولپنڈی میں چوہدری غلام عباس کے گھر
آل پاکستان کشمیر کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہوئے یہ وہ وقت
تھا جب چھمب اور جوڑیاں کو فتح کیا جا چکا تھا۔ ہماری
فوجیں اکھنور کی طرف بڑھ رہی تھیں چونکہ چوہدری
غلام عباس بڑے مخلص کشمیری رہنما تھے اور وہ خلوص
سے چاہتے تھے کہ کشمیر کا الحاق جلد از جلد پاکستان کے
ساتھ ہو جائے اس لئے وہ بے حد خوش تھے۔ تو اس
اجلاس میں ہم نے اپنے خدشات کا اظہار کیا کہ معلوم
پاکستان کے دفاع کا خاطر خواہ بندوبست کر لیا گیا ہے
یا نہیں کیونکہ بار بار ہندوستانی رہنماؤں کے بیانات
آ رہے تھے کہ خصوصاً لال بہادر شاستری نے لوک سبھا میں
اعلان کیا تھا کہ کشمیر پر حملہ ہوا تو ہم اپنی مرضی کا محاذ کھولیں
گے جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ پاکستان پر حملہ کریں
گے یہ بھی ان کی طرف سے کہا گیا تھا کہ کشمیر پر حملہ، ہندوستان
پر حملہ تصور کیا جائے گا رات کو میں خیبر میل سے لاہور
کے لئے روانہ ہوئے دھونکل پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہاں
پر بمباری ہو چکی تھی ہندوستان نے پاکستان پر حملہ
کر دیا تھا میں لاہور پہنچ گیا لیکن مولانا مودودی اور
چوہدری محمد علی ابھی راولپنڈی میں ہی تھے میں اپنی رہائش
گاہ پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک انفارمیشن آفیسر ایوب
خان کا پیغام لیے مجھے تلاش کر رہے ہیں ملاقات ہوئی
تو معلوم ہوا کہ ایوب خان آج حزب اختلاف کے رہنماؤں
سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں اس وقت تک ریل گاڑیاں
بند کر دی گئی تھیں ہوائی جہاز کی سروس بند کر دی گئی تھی
کوئی طریقہ ایسا نہ تھا کہ میں پہلے پہر راولپنڈی پہنچ سکتا
پھر مجھے میں نے راولپنڈی میں مولانا مودودی اور
چوہدری محمد علی سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ آپ اس
میٹنگ میں شریک ہوں گے اس لئے ایوب خان کو میری

طرف سے بھی پورے تعاون کا یقین دلا دیجئے میٹنگ ہوئی اور انہوں نے ایوب خاں کو غیر مشروط تعاون دلایا۔ اس تعاون کو اگر اس پس منظر میں دیکھا جائے کہ یہ ان جماعتوں کے رہنما تھے جن کے خلاف صدارتی انتخابات اور قومی اسمبلی کے انتخابات میں دھاندلی کی گئی تھی۔ لیکن جب ملک کے دفاع اور سالمیت کا مسئلہ سامنے آیا تو انہوں نے اصولی اختلافات کو بھلا کر بھی حزب اختلاف کی طرف سے مکمل تعاون کا یقین دلایا اگر آپ کو یاد ہو تو مولانا نے ریڈیو پر بھی کئی مرتبہ خطاب کیا۔

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے آخری دنوں میں ایوب خاں نے حزب مخالف کے رہنماؤں کو دعوت دی۔ میں گاؤں میں تھا میں نے معذرت کر لی۔ میں نے اپنے دوستوں سے رابطہ قائم کیا۔ مولانا مودودی اور چوہدری محمد علی تشریف لے گئے بعد ازاں مولانا مودودی نے مجھے بتایا کہ ایوب خاں کے اعصاب شکستہ تھے ایوب خاں نے کہا کہ ڈیفنس سیکرٹری آپ کو تمام واقعات بتائیں گے اور وہ واقعات کیا تھے کیا بڑی مایوس کن صورتحال ہے ایمونیشن ختم ہوتا جا رہا ہے۔

(REPLACEMENT) نہیں ہو رہی امریکہ نے امداد نہیں دی۔ وغیرہ وغیرہ اس لئے جنگ کو زیادہ عرصہ تک جاری نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے جنگ بندی ہونی چاہیئے جس پر مولانا مودودی اور چوہدری محمد علی نے مشورہ دیا کہ آپ (ایوب خاں) کو جرات کا مظاہرہ کرنا چاہیئے پوری قوم آپ کے ساتھ ہے اور قربانی دینے کے لئے تیار ہے۔ اور اگر آپ کچھ دن مزید جنگ جاری رکھ سکیں اپنے علاقے کے دشمن کے قبضہ سے چھڑا سکیں اور دشمن کے علاقوں پر قبضہ مضبوط بنا سکیں تو شاید بہتر TERMS پر بات کر سکیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کشمیر کا بھی کوئی تصفیہ کرا سکیں چونکہ ایوب خاں کے اعصاب جواب دے چکے تھے

اس لئے انہوں نے یہ تجویز تسلیم نہ کی۔ بالآخر جنگ بندی ہو گئی۔ اس کے بعد امریکہ صدر کا ایوب خاں کو دعوت نامہ موصول ہوا۔۔

مولانا مودودی اور ہم سب کی رائے تھی کہ امریکی حکومت جنگ کے دوران جو طرز عمل اختیار کیا تھا اور تمام دو طرفہ دفاعی معاہدوں اور سینٹو کے معاہدہ کی بنا پر ہم اس بات کے مستحق تھے کہ امریکہ ہماری مدد کرتا۔ لیکن امریکہ نے اس کے بالکل برعکس رویہ اختیار کیا۔ اور ہماری فوجی امداد بھی بند کر دی

اس وجہ سے ہماری رائے تھی کہ خودداری اور قومی غیرت کا مظاہرہ کرنا چاہیئے چنانچہ مولانا مودودی چوہدری محمد علی سردار شوکت حیات اور ہم سب اکٹھے ہوئے اور ایک مشترکہ بیان دیا اس بیان پر پابندی عاید کر دی گئی اور یہ بیان پریس میں شائع نہ ہونے دیا گیا اس کے باوجود ہم نے اسے ہزاروں کی تعداد میں شائع کرا کے تقسیم کیا۔

بہرحال ہمارے تمام احتجاج کے باوجود ایوب خاں امریکہ گئے اور اس کے بعد روسی وزیراعظم کوسیجن نے صدر ایوب خاں اور بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری کو دعوت دی کہ وہ تاشقند پہنچ جائیں تاکہ امن کے مذاکرات کئے جائیں وہاں سے ابتدائی رپورٹیں یہ موصول ہوئیں کہ ہمارا وفد اپنے موقف پر قائم ہے لیکن اس کے بعد یک لخت کوئی ایسی صورتحال پیدا ہوئی کہ ہمارے وفد کو اعلان تاشقند پر دستخط کرنے پڑے اور اب یہ کوئی راز نہیں رہا کہ کشمیر کے مسئلہ سے بھی مرتبہ تاشقند میں بے وفائی کی گئی تھی مولانا مودودی اور چوہدری محمد علی کی رائے تھی اسی مسئلہ پر نیشنل کانفرنس بلائی جائے چنانچہ اس رائے کی پابندی کرتے ہوئے میں مشرقی پاکستان گیا نور الامین اور این ڈی ایف کے

دیگر رہنماؤں میں شیخ مجیب الرحمٰن اور روزنامہ اتفاق کے ایڈیٹر مانک میاں بھی تھے جن کا دیگر سیاستدانوں پر ان کا اثر بہت زیادہ تھا انہیں آمادہ کیا کہ وہ لاہور میں نیشنل کانفرنس میں شرکت اختیار کریں۔ نیشنل کانفرنس ہوئی جس کو سبوتاژ کرنے کے لئے مجیب الرحمٰن نے چھ نکاتی پروگرام پیش کیا۔

مولانا مودودی اور ہم سب نے یہ موقف اختیار کیا کہ زیر بحث مسئلہ اعلان تاشقند کے سوا نیشنل کانفرنس میں کوئی دوسری بات زیر بحث نہیں آسکتی۔

نیشنل کانفرنس کے فوراً بعد میں نے اعلان کیا کہ عوامی لیگ کی مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس ڈھاکہ میں ہوگا تاکہ وہاں اس مسئلہ پر بحث کر کے اسے سیاسی طور پر ختم کرنے کی کوشش کی جائے لیکن ایوب خان مرحوم نامعلوم کسی وجہ سے یہ تاثر دینا اور برقرار رکھنا چاہتے تھے کہ حزب اختلاف میں انتشار موجود ہے اس لئے وہ چھ نکات کو ہوا دینے لگے اور مجھے ڈھاکہ جانے سے روکنے کے لئے گاؤں سے گرفتار کرلیا اور نو، دس ماہ مختلف جیلوں میں نظربند رکھا...

جب میں رہا ہوا اور لاہور آیا تو مولانا مودودی ملنے کے لئے آئے اور دیگر اصحاب بھی تشریف لائے تو میں نے کہا کہ ہمیں حزب اختلاف کو متحد کرنے کا کام پھر سے شروع کردینا چاہیئے مولانا مودودی نے مکمل اتفاق کیا۔ مجھے یاد ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو بھی ملے۔ مسٹر بھٹو نے آئندہ کا پروگرام پوچھا... تو میں مسٹر بھٹو کو بتایا کہ میں مشرقی پاکستان جانے کا ارادہ رکھتا ہوں تاکہ حزب اختلاف کی کوئی تنظیم قومی سطح پر قائم کی جاسکے۔ بھٹو صاحب نے بڑی پریشانی کے عالم میں کہا کہ اگر آپ نے کھلے عام اس طرح کا اظہار کیا تو ہوسکتا ہے کہ آپ کو پھر گرفتار کر کے نظربند کردیا جائے اسے خفیہ طریقے سے سرانجام دیجئے... میں نے عرض کیا کہ یہ کام خفیہ طریقے سے نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ مرکزی مجلس عاملہ میں زیر بحث آئے گی۔ اسے خفیہ کیونکر رکھا جاسکتا ہے۔

بہرحال مشرقی پاکستان جانے کے لئے کم از کم پروگرام طے کیا گیا... جو مولانا مودودی اور چوہدری محمد علی کے مشورہ سے کیا گیا۔ ڈھاکہ جانے سے قبل طے کیا گیا۔

جو مولانا مودودی اور چوہدری کے مشورہ سے کیا گیا ڈھاکہ جانے سے قبل کراچی میں میاں ممتاز دولتانہ سے بھی مسٹر بھٹو نے اس موقع پر ہمیں رات کے کھانے کی اپنے گھر میں دعوت دی ہیں اور جب دولتانہ صاحب وہاں پہنچے۔ تو انہوں نے کہا کہ مشرقی پاکستان میں اتحاد کی صورت پیدا ہو تو مغربی پاکستان دیگر رہنماؤں کے ساتھ انہیں (بھٹو) کو بھی دعوت دی جائے مشرقی پاکستان میں کئی روز کی جدوجہد کے بعد مشرقی پاکستان کے قائدین کو آمادہ کرلیا کہ کوئی مشترکہ تنظیم اس جدوجہد کے لئے بنائی جائے اور اس کے ابتدائی نکات مرتب کرنے کے۔ مغربی پاکستان کے رہنماؤں کو مشرقی پاکستان پہنچنے کے لئے کہا گیا مولانا مودودی اور دیگر رہنما وہاں پہنچ گئے جب بھٹو صاحب کو اطلاع دی گئی تو انہوں نے جواب دیا کہ میں محرم کی وجہ سے مصروف ہوں لیکن جب آپ لاہور میں دوسرا اجلاس منعقد کریں گے تو اس میں ضرور شامل ہوں گا۔

مشرقی پاکستان میں نکات مرتب ہوگئے، لاہور میں اجلاس ہوا جس میں تنظیم ڈھانچہ قائم کرنا تھا اور عہدیداروں کا انتخاب ہونا تھا۔

عہدیداروں کے لئے دو نام تھے ایک جناب نورالامین کا اور دوسرا نام میرا تھا۔ ہماری خواہش تھی کہ یہ مسئلہ ووٹنگ کے بغیر متفقہ طور پر طے ہوجائے بالآخر یہ طے ہوا کہ عہدیداروں کے بارے میں مولانا مودودی ایک پوری فہرست مرتب کریں جو منظور کرلی جائے چنانچہ مولانا مودودی نے میرا نام صدارت کے لئے تجویز کیا... جنرل سیکرٹری کے لئے محمود علی نائب صدر

خواجہ خیر الدین، مولوی فرید احمد وغیرہ اور یہ فہرست متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔ اس تحریک کا نام P.D.M. رکھا گیا۔ ہم نے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کا دورہ کیا۔ مولانا مودودی نے ہمارے ساتھ رابطہ عوام کی مہم کو چلایا...... میں نے بحیثیت یہ دیکھا کہ سیاسی حالات کا تجزیہ کرنے انہیں سمجھنے اور پھر فیصلہ کرنے کی صلاحیت مولانا مودودی میں موجود تھی...... ان کی عملی سیاست سے ریٹائرمنٹ کو ایسی کمی قرار دیا جاسکتا ہے جو ہم نے مسلسل محسوس کی۔ یہ کمی مشورہ رائے بر وقت فیصلہ کرنے کی صلاحیت کے سلسلہ میں خصوصی طور پر سامنے آئی انہوں نے دوستوں سے مخلصانہ تعاون کیا اور واقعہ یہ ہے کہ

PDM کے دنوں میں ہمارا آپس میں رابطہ وضبط تھا اور DAC اور PDM بھی۔ بعد ازاں ہمیں UDF اور PNA میں جو شکایتیں پیش آئیں اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مولانا مودودی اور چوہدری محمد علی جیسے اکابر ہمارے درمیان موجود تھے ان کی ذہنی صلاحیتوں خلوص اور کردار کی بلندی کبھی دو ذہنی یا دو دلی کی صورتحال پیدا نہیں ہونے دیتی تھی

ہمارے اور ان کے درمیان اختلافات شدید نوعیت کے بھی رہے ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی تلخی نہیں ہوئی تھی کیونکہ اختلافات ذاتی نہیں ہوتے تھے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں ان کے اور ہمارے درمیان لاہور کے لاہور کے حلقہ نمبر ۲ پر ناگوار جیسی صورت ہوئی انتخاب کے بعد میں لاہور میں شورش کاشمیری مجھے ملنے آئے انہوں نے بتایا کہ مولانا مودودی بیمار ہیں میرے ٹیلیفون سے ان کی خیریت دریافت کی اور یہ بھی کہہ دیا کہ ہم دونوں عیادت کے لئے آپ کے پاس آرہے ہیں..... ہم چلے گئے، ملاقات کے دوران مولانا نے ناگواری کا اس تلخ واقعہ کا میرے ساتھ ذکر نہیں کیا۔ اس کے علاوہ جب کوئی بھی ایسا مسئلہ سامنے آیا جس پر ہم نے طے کیا کہ مولانا مودودی کی رائے حاصل کی جائے۔ مشورہ لیا جائے یا ان کی اخلاقی تائید حاصل کی جائے کیونکہ ریٹائرمنٹ کے باوجود ان کا اثر جماعت اسلامی پر بدستور موجود تھا۔ مجھے علم ہے کہ مولانا نے متعدد مرتبہ ہمارے ساتھ اتفاق رائے کے بعد اپنے اثر کو استعمال کیا۔

مسٹر بھٹو کے دور میں بے شمار واقعات رونما ہوئے، جن کو قلمبند کرنے کے لئے دفتروں کی ضرورت ہے۔ ایک واقعہ کا ذکر سنئے کہ مولانا مودودی نے ایک بیان اس وقت جاری کیا جب بھٹو صاحب کے خلاف تحریک جاری تھی۔ ہماری رائے میں ان کا بیان تحریک کے لئے سود مند نہیں تھا۔ اور مولانا جان محمد عباسی مولانا کے پاس گئے۔ اپنے دلائل ان کی خدمت میں پیش کئے۔ اور ان کی یہ بہت بڑی خوبی تھی کہ وہ .... OPENTOCON VICTION ہوتے تھے۔ اگر کوئی انہیں کوئی دلائل سے قائل کرے تو وہ سیاسی حالات میں اپنی رائے بدلنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ بہرحال مولانا نے ہمارے ساتھ اتفاق کیا کہ ان کا بیان موقع محل کے لحاظ سے سود مند نہیں تھا۔

حال ہی میں جنرل ضیاء الحق کی وزارت سے قومی اتحاد کی علیحدگی کا مسئلہ پیدا ہوا تو میں نے مولانا مودودی سے ملاقات کی...... اپنا تجزیہ پیش کیا....... تو انہوں نے حرفاً حرفاً اتفاق کیا اور انہوں نے مجھے کہا کہ ان حالات میں آپ اخلاقاً انہیں (جنرل ضیاء الحق) کو کے لئے۔ کہ یہ حالات ہیں جن کی بناء پر میرے لئے وزارت میں شامل رہنا ممکن نہیں ہے۔ ان کو کہنے کے بعد بے شک وزارت سے علیحدہ ہوجائیں۔

مولانا مودودی کے ساتھ ملاقات کے دوران اکثر اوقات ایسا ہوا ہے کہ جب چائے پیش کی گئی تو مولانا نے کہا کہ انہیں (نوابزادہ نصراللہ خاں) چائے پیش کرنا چائے کے ساتھ زیادتی ہے۔ کہا کرتے تھے مولانا جس التزام کے ساتھ پان کھایا کرتے تھے وہ سب کو معلوم ہے۔ میں بھی پان کھاتا ہوں، اگر کبھی وہ میری موجودگی میں پان کھاتے اور

آپ کے علاوہ فرمائیں

بقیہ صفحہ ۴۸ پر دیکھئے

بیگم مودودی سے ایک ملاقات

"میرا سیاستدان شوہر" کا سلسلہ شروع کیا تھا کہ فرمائشیں آنے لگیں کہ بیگم مودودی کا انٹرویو ضرور چھاپئے گا بلکہ کئی خطوط میں تو سوال بھی بھیجے جانے لگے۔ ایک دو بار بیگم صاحبہ سے فون پر بات کی تو وہ رضامند نہ ہوتیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم لوگ نام و نمود اور پبلک میں آنا نہیں چاہتے۔ منصورہ میں ایک دن ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے یہی جواب دیا۔ تب میں نے کہا کہ "آپ کے گھر آپ لوگوں کی لائف پر تو سب سے زیادہ تبصرہ کیا جاتا ہے۔ کبھی بچیوں کی پڑھائی، کبھی شادی کی رونق کبھی کسی بہو کی تعلیم یا بے نقابی۔ پھر آپ کی طرف سے کبھی تردید کے بعد عوام اپنے طور پر اسے تصدیق کر لیتے ہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ آپ تصدیق یا تردید کے حق میں وضاحت کر دیں۔ جس سے وہ انٹرویو کے لئے رضامند ہو گئیں مگر پھر اپنی علالت کے باعث دوبارہ وقت نہ دے سکیں طبیعت سنبھلی تو وقت لیا اور......

مارچ میں جب لوگ کہہ رہے تھے کہ بے وقت کی بارشوں نے آنے والی گرمیوں کو روک لیا ہے بادلوں کے سائے میں ایک دن میں ان کی اچھرہ والی قیام گاہ پر جا پہنچی۔ بیگم صاحبہ نے کمال شفقت سے ہیٹر کا سوئچ آن کر دیا اور لوازمات منگوا لئے اور ایک بار پھر انٹرویو سے انکار کی فضا قائم کرنا چاہی کہ اس لئے بھی کہ وہ چند روز قبل علالت میں مبتلا رہی ہیں۔ بہرحال میں نے خواتین کے بھیجے ہوئے سوالات ان کے حوالے کئے۔ پہلے مجھے معلوم ہے کہ آپ بے حد الٹرا ماڈرن گھرانے کی بیٹی ہیں آپ اپنے وقت کی فیشن ایبل لڑکی تھیں جب آپ کی شادی ہوئی تو مولانا کتابوں رسالوں میں کھوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ ان کے نظریات کو اپنا لیں گی یا وہ آپ کی فکر کے قائل ہو جائیں گے۔ مجھے اتنا بتا دیجئے کہ آپ کی تعلیم کہاں ہوئی اور آپ نے اپنے شوہر کے نظریات کس طرح اور کیوں اپنا لئے۔

انہوں نے مسکرا کر کہا! ہاں میرا گھرانا اپنے وقت کا الٹرا ماڈرن گھرانا تھا۔ میرے والد سید نصیر الدین شمسی سرکاری ملازم تھے۔ ویسے مولانا اور میں ایک ہی خاندان سے ہیں۔ ان دنوں مولانا اپنا ذاتی پرچہ "ترجمان القرآن" حیدر آباد دکن سے نکالتے تھے۔ ان کے والد اورنگ آباد حیدر آباد میں پریکٹس کر رہے تھے اور مولانا کی پیدائش بھی اورنگ آباد میں ہوئی تھی۔ اور یہ لوگ وہاں ہی رہتے تھے۔ میری تعلیم دہلی میں ہوئی۔ میں نے وہاں کوئین میری میں تعلیم حاصل کی اور پھر گھر بیٹھ گئی۔

میرے اور مولانا کے گھرانے کے ماحول میں فرق تھا مگر میری ساس بے حد اچھی تھیں۔ انہوں نے مجھے بہت اچھی طرح رکھا اور پھر میرے خاوند مثالی خاوند ہیں۔ بے حد مہربان، شفیق اس لئے نئے ماحول کو اپنانے میں مجھے دقت نہ ہوئی اور جب بچی شادی کے بعد نئے گھر جاتی ہے تو اسے نئے ماحول سے واسطہ پڑتا ہے۔ ہر بچی کو نیا ہی ماحول ملتا ہے میں نے کچھ نئے ماحول میں سیکھا جس طرح انہوں نے اپنے کو ایڈجسٹ کیا اس کا سارا کریڈٹ مولانا کو جاتا ہے۔ انہوں نے سکھایا میں نے سیکھا۔ میری اب جو اچھائیاں ہیں، انہیں کی بدولت ہیں۔

میں یہ پوچھ رہی تھی کہ آپ کے شوہر نے آپ کو اپنے نظریات

تو عمل کس طرح کیا انہوں نے آپ کو جھکایا یا آپ خود جھکتی چلی گئیں۔

بات یہ ہے کہ ہم نے بہت جلد ایک دوسرے کو سمجھ لیا انہوں نے مجھ پر نظریات ٹھونسے نہیں، نہ ہی مجھے جھکانا چاہا۔ انہوں نے مجھے شفقت سے نئے ماحول سے متعارف کرایا مجھے پسند آیا اور میں نے ان نظریات کو اپنا لیا اسی لئے ہماری ازدواجی زندگی بے حد خوشگوار گذری۔ بے حد خوشگوار۔ بیگم صاحبہ نے بڑے سرور سے مصرعہ پڑھا،

قیاس کُن زِ گلستانِ من بہار مرا

آپ کے شوہر اسلامی سیاست میں تھے۔ گھر کا ماحول بھی تھا۔ پھر انہوں نے اسلامی جماعت بنانے کا کیوں سوچا؟ اور یہ جماعت بنا لینے کا منصوبہ ان کے اکیلے ذہن کی شوخ ہے یا اس میں کوئی اور بھی تھی۔

مولانا ترجمان نکالتے تھے ان کے زیر مطالعہ اسلامی کتب تھیں انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک صالح جماعت بنانے کا سوچا تھا۔ نبی کریمؐ کی انقلابی تحریک میں علمائے دین صلحائے دین کی مثالیں تھیں۔ جو تحریکیں نیک مقاصد کے لئے اپنے اپنے وقتوں میں چلیں اور کامیاب ہوئیں۔ ان کا مطلب مسلمانوں کو نام ہی کے نہیں بلکہ پوری طرح صالح مسلمان بنانا تھا۔

مولانا کی اس فکری شوخ نے عملی شکل کب اختیار کی؟

یہ ۱۹۴۱ کی بات ہے ان دنوں مولانا لاہور میں تھے۔ یہاں سے ترجمان القرآن نکالتے تھے تو مولوی ظفر اقبال کے گھر کے سامنے اسلامیہ پارک میں یوم تاسیس منایا گیا۔ اس میں ہندوستان کے ۵۵ بے شمار لوگ جو ترجمان القرآن پڑھتے تھے مولانا کی تحریروں کو پسند کرتے تھے ان کی اس جماعت میں شامل ہوئے۔

آپ بتا سکتی ہیں کہ اس وقت خواتین کی کتنی تعداد تھی؟

اس وقت جہاں تک میرا خیال ہے خواتین زیادہ نہ تھیں۔ ایک تو حیدرآباد کے محمود یار جنگ کی بیگم تھیں، دوسری نصراللہ خان عزیز کی بیگم تھیں۔ تیسری نیر بانو۔

آپ کی جماعت میں لوگ چوری چھپے آتے یا؟

چوری چھپے کیوں جب تک یعنی انگریزوں کے وقت تک اس پر کوئی پابندی نہ تھی۔ ہمارے کل ہند اجتماعات ہوئے اور بہت کامیاب رہے

آپ لوگ پٹھان کوٹ کیوں چلے گئے؟

ہم لوگ ۴۱ء کے آخیر میں پٹھان کوٹ گئے تھے۔ ترجمان القرآن پہلے حیدرآباد سے نکلتا تھا پھر لاہور اور اس کے بعد پٹھانکوٹ سے۔ وہاں دارالسلام بنایا تھا۔

دارالسلام سے مجھے یاد آیا کہ پٹھانکوٹ کے دارالسلام میں جماعت والوں کی یکجائی آپس کی علیحدگی کا باعث بنی۔ ایک ہی حیثیت سے لوگوں کا معیارِ زندگی جب سامنے کھل کر آیا تو اس میں خاصا فرق تھا جس کے باعث بہت سے لوگ جماعت سے علیحدہ ہو گئے؟

نہیں یہ بات غلط ہے۔ ابتدا میں کچھ لوگ دعوت اور تبلیغ کے نظریے سے آئے مگر جب ساتھ چلنا پڑا تو اس کی ہمہ گیری کا ساتھ نہ دے سکے۔ سمجھ لیجیے لوگ تھیوری پڑھتے چلے آئے مگر پریکٹیکل میں ساتھ نہ دے سکے۔ وہ جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔ ان میں مولانا عبدالماجد دریابادی بھی تھے ورنہ ہمارا منصوبہ خاصا کامیاب رہا تھا۔

> آپ یقین فرمائیں کہ ایک شیطانی طاقت دنیا میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتی ہے۔ میں خدا کے بھروسے پر اس کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو چکا ہوں، لہٰذا جو کچھ سامنے آتا ہے وہ میری توقعات سے کم ہی ہوتا ہے اور میرے ارادے پر اس کا اتنا اثر بھی نہیں ہوتا، جتنا کسی چٹان پر مچھر کے حملے کا ہوتا ہے۔
>
> وما توفیقی الا باللہ۔

مولانا مودودی اپنا تعارف خود کراتے ہیں

میرا بچپن ریاست حیدرآباد کے مشہور شہر اورنگ آباد دکن میں گذرا ہے۔ میرا خاندان تو دہلی کا تھا لیکن میرے والد دہلی سے اورنگ آباد چلے گئے تھے۔ اس وجہ سے میری زندگی کے ابتدائی تیرہ چودہ سال اورنگ آباد میں ہی بسر ہوئے۔ جو لوگ ایک ہی جگہ پل کر جوان ہوئے ہیں اور ساری عمر اپنے پیدائشی وطن ہی میں رہے ہیں، وہ اس بات کا پورا اندازہ نہیں کر سکتے کہ آدمی کو اس جگہ سے کتنی گہری محبت ہوتی ہے جہاں اس نے اپنا بچپن گذارا ہو۔

تیرہ چودہ سال کی عمر تک میں وہیں رہا۔ پھر میرا یہ پیدائشی وطن مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا۔ برسوں کے بعد جوانی کی عمر میں جب مجھے ایک دفعہ اورنگ آباد جانے کا اتفاق ہوا تو میرے اوپر عجیب کیفیت گذری۔ جوں جوں شہر قریب آتا جاتا تھا میری بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ریل بہت سست چل رہی ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ریل پر سے کود جاؤں اور بھاگ کر شہر میں جا پہنچوں۔ بچپن کی دیکھی ہوئی ہر چیز کو میں پہچاننے کی کوشش کرتا تھا۔ اور میرا دل بے اختیار کھنچے لگتا تھا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ آدمی کو اس جگہ سے کتنی گہری محبت ہوتی ہے جہاں اس کا بچپن گذرا ہو۔

ایک عجیب بات جو میں نے وہاں جا کر محسوس کی وہ یہ تھی کہ بچپن کی دیکھی ہوئی کوئی چیز بھی اب اتنی بڑی نہیں تھی جتنی چند سال پہلے تھی۔ سڑکیں، بازار، گلیاں عمارتیں سب پہلے سے چھوٹی اور کچھ تنگ سی ہو گئی تھیں [illegible] بڑے تھے۔ اور اب سڑکیں بالکل چھوٹے چھوٹے ہو گئے تھے میں حیران تھا کہ جس چیز کو بھی اپنی یاد کے نقشے میں ملا کر دیکھتا ہوں وہ ہے تو اپنی جگہ ہی پر مگر پہلے سے چھوٹی ہو کر رہ گئی ہے۔ آخر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ سارا فرق جو مجھے محسوس ہو رہا ہے دراصل ان چیزوں میں نہیں ہوا بلکہ خود میرے اندر ہو گیا ہے۔ جب تک میں بچہ تھا میری نگاہ چھوٹی تھی، اور چیزیں بڑی نظر آتی تھیں۔ جب میں بڑا ہو گیا تو میری نگاہ بھی بڑی ہو گئی اور چیزیں اسی لحاظ سے چھوٹی نظر آنے لگیں۔

مجھے اپنی بہت چھوٹی عمر کی باتیں بھی اب تک یاد ہیں۔ مجھے اپنی حیرت اب تک یاد ہے جو مجھے پہلی مرتبہ یہ سن کر ہوئی تھی کہ ابا کے ابا کو دادا، اور ابا کی اماں کو دادی کہتے ہیں۔ میرا دل یہ یقین کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھا کہ ابا بھی کسی کے بیٹے ہو سکتے ہیں، اور نہ میں یہ تصور کر سکتا تھا کہ میرے والد بھی کبھی میری طرح بچے ہوں گے۔ اس نئی معلومات پر میں بہت دنوں تک غور کرتا رہا، اور یہ بات بڑی تحقیقات کے بعد میری سمجھ میں آئی کہ جتنے لوگ اب بوڑھے ہیں، یہ سب کبھی بچے تھے۔ اور ان کے بھی کوئی ماں باپ تھے۔

میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ میرے ایک بھائی مجھ سے تین چار سال بڑے تھے۔ مجھے کھانے کو جو چیز ملتی تھی اسے فوراً کھا لیتا تھا، مگر بھائی صاحب سنبھال کر رکھتے تھے۔ اچھے وقت پر کھانے کے لئے اٹھا رکھتے تھے۔ اسی طرح جو پیسے مجھے ملتے تھے ان کو

میں خود خرچ کر ڈالتا تھا اور بھائی صاحب انھیں جمع کر کے کبھی کوئی اچھی چیز خرید لاتے تھے۔ بس یہ میرے اور ان کے درمیان جھگڑے کی بنیاد تھی۔ میں ہمیشہ ان کے حصے میں سے اپنا حق وصول کرنے کی کوشش کرتا تھا اور وہ بھی تھوڑی دیر تک مقابلہ کرنے کے بعد کچھ نہ کچھ میرے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اوّل تو میں سمجھا کرتا تھا کہ اس طرح میں انھیں شکست دے کر مالِ غنیمت حاصل کرتا ہوں، مگر بعد میں مجھے معلوم ہو گیا کہ بڑے بھائی کو مجھ سے محبت ہے اور انھیں خود بھی اسی میں مزہ آتا ہے کہ میں ان سے لڑ جھگڑ کر اپنا حصہ وصول کر لیا کروں۔ اس طرح میں والدین کے حصوں میں سے ۷۵ فیصدی کا مالک ہوتا تھا، پچاس فیصد اپنے حساب میں، اور پچیس فیصد بڑے بھائی صاحب کے حساب میں سے۔ مشہور بات تو یہ ہے کہ "سگ باش برادرِ خورد مباش"، یعنی چھوٹا بھائی بننے سے کتا بننا زیادہ بہتر ہے، مگر میرا تجربہ اس کے خلاف ہے۔

میرے والد مرحوم نے میری تربیت بڑے اچھے طریقے سے کی تھی۔ وہ دہلی کے شرفاء کی نہایت ستھری زبان بولتے تھے۔ انھوں نے ابتداء سے یہ خیال رکھا تھا کہ میری زبان بگڑنے نہ پائے۔ جب کبھی میری زبان پر کوئی غلط لفظ چڑھ جاتا یا کوئی بازاری لفظ سیکھ لیتا تو وہ مجھے ٹوک دیتے اور صحیح بولنے کی عادت ڈالتے۔ یہی وجہ ہے کہ دکن میں پرورش پانے کے باوجود میری زبان محفوظ رہی۔ بعد کو مجھے ہندوستان کے مختلف حصوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے، مگر بچپن میں جو زبان پختہ ہو چکی تھی اس پر کسی جگہ کی بولی کا اثر نہ پڑ سکا۔ وہ راتوں کو مجھے پیغمبروں کے قصے، تاریخ اسلام اور تاریخ ہندوستان کے واقعات اور سبق آموز کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ اس کا مفید اثر میں آج تک محسوس کرتا ہوں، اور وہ میرے اخلاق کی درستی کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے مجھے ایسے لڑکوں کے ساتھ نہیں کھیلنے دیا جن کی عادتیں بگڑی ہوئی ہوں۔ جب کبھی میں کوئی بری عادت سیکھ لیتا تھا تو بڑی کوشش سے اسے چھڑاتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے ایک ملازمہ کے بچے کو مارا تو انھوں نے اس بچے کو بلا کر کہا "تو بھی اسے مار"۔ اس سے مجھے ایسا سبق ملا کہ پھر تمام عمر میرا ہاتھ کسی زیر دست پر نہیں اٹھا۔ وہ مجھے زیادہ تر اپنے ساتھ اپنے دوستوں کی صحبت میں لے جاتے تھے۔ اور ان کے دوست سب کے سب سنجیدہ، شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان صحبتوں میں بیٹھنے کی وجہ سے میں مہذب عادات سیکھ گیا، اور بڑی بڑی باتوں کو سمجھنے کے قابل ہو گیا۔ میری طبیعت میں جتنی شوخی تھی، والد مرحوم کی اس تربیت کی وجہ سے وہ شرارتوں اور دنگے فساد کے بجائے ظرافت کی شکل میں ڈھل گئی۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں مجھ سے بڑی عمر کے لوگ میرے ساتھ بہت دلچسپی لیا کرتے تھے، کیونکہ میں شرارت کرنے کے بجائے بہت مزے مزے کی باتیں کیا کرتا تھا۔

میرے والد مرحوم نے میری ابتدائی تعلیم کا انتظام گھر پر کیا تھا۔ غالباً وہ میری زبان کی حفاظت کے لیے اور مجھے بری صحبتوں سے بچانے کے لیے مجھے مدرسے بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ گھر کی اس تعلیم میں مجھ کو بہت سے استادوں سے سابقہ پیش آیا۔ بعض استاد ایسے تھے جنھوں نے مجھے کند ذہن بنانے کی کوشش کی تھی، اور ان کے اثر سے مجھے خود اپنے اوپر یہ شک ہونے لگا کہ شاید میں کچھ پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بعض استادوں نے مجھے اس سے زیادہ پڑھانے کی کوشش کی جتنا میں اپنی عمر کے لحاظ سے پڑھ سکتا تھا۔ البتہ بعض استادوں نے مجھے بہت اچھی تعلیم دی، اور مجھے جو کچھ حاصل ہوا وہ انہیں کا فیض تھا۔ مجموعی طور پر اس سے میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ گھر کی تعلیم میرے لیے مدرسے کی بہ نسبت زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ پانچ چھ سال کی اس تعلیم میں مجھ کو اتنا علم حاصل ہو گیا جو مدرسے میں بچوں کو آٹھ دس سال میں ہوتا ہے۔ اگر جب

مجھے گیارہ سال کی عمر میں مدرسے کی آٹھویں جماعت میں داخل کیا گیا تو اکثر مضمون میں میری معلومات اپنے ہم جماعتوں سے زیادہ تھیں، حالانکہ میں اپنی آٹھویں کلاس میں سب سے چھوٹی عمر کا طالب علم تھا۔

میری ابتدائی تعلیم میں ایک خرابی ایسی تھی جس کو بعد میں مجھے بری طرح محسوس کیا۔ وہ خرابی یہ تھی کہ عام دستور کے مطابق مجھے سب سے پہلے بغدادی قاعدہ پڑھوا کر قرآن پڑھوا دیا گیا۔ یہ غلطی عام طور پر مسلمان اس زمانے میں کرتے تھے، اور آج تک کئے جا رہے ہیں۔ اس کا نقصان یہ ہے کہ بچہ دنیا کی اور ساری چیزیں تو سمجھ کر پڑھ لیتا ہے۔ مگر صرف قرآن ہی کے متعلق وہ خیال کرتا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اس کے الفاظ پڑھ لینے کافی ہیں۔ اس غلط طریقہ کی وجہ سے مجھے بے سمجھے قرآن پڑھنے کی ایسی عادت پڑی کہ آگے چلکر جب میں نے عربی زبان پڑھ لی اس وقت بھی برسوں تک قرآن کو بغیر سمجھے ہی پڑھتا رہا۔ اکیس سال کی عمر میں مجھ کو پہلی مرتبہ اپنی اس غلطی کا احساس ہوا، اور میں نے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میں چاہتا ہوں کہ اب مسلمان بچوں کو اس غلطی سے بچایا جائے، اور انھیں قرآن اس وقت پڑھایا جائے جب وہ کم از کم اتنی اردو پڑھ لیں کہ قرآن کا ترجمہ ساتھ ساتھ پڑھ سکیں۔

اب میں تھوڑا سا حال اپنے مدرسے کا بیان کرتا ہوں۔ گیارہ برس کی عمر میں جب مجھ کو ہائی اسکول کی آٹھویں جماعت میں داخل کیا گیا اس وقت مجھے پہلی مرتبہ اپنے ہم عمر لڑکوں سے میل جول کا موقع ملا، کیونکہ اس سے پہلے تک تو میں زیادہ تر بڑوں کی صحبت میں رہا تھا۔ مدرسے میں اول اول تھوڑے دنوں تک اجنبی رہا۔ پھر میں نے مدرسے کی اس شریف ٹولی سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لئے جس میں سنجیدہ اور خوش مزاج طالب علم شامل تھے لیکن ان کے ساتھ ہی میں نے کچھ اپنی ظرافت کے ذریعہ سے شریر ٹولی کے بھی دو تین سرغنوں کو دوست بنا لیا تھا۔ میں ان کی شرارتوں میں تو شریک نہیں ہوتا تھا، مگر مذاق اور لطیفہ گوئی کی وجہ سے میں نے ان کو رام کر لیا تھا۔ اسطرح میں شریف ٹولی کا دوست بھی رہا، اور شریر ٹولی سے میرے تعلقات بھی نہیں بگڑے۔ استادوں میں سے اکثر میرے اوپر مہربان تھے۔ خصوصاً ایک استاد تو ایسے شفیق بن گئے کہ آج تک ان کے خاندان سے میرے تعلقات قائم ہیں۔ اور ان کے صاحبزادے کو میں اپنے بھائی کی طرح عزیز رکھتا ہوں۔ مدرسے ہی میں مجھ کو پہلی مرتبہ مضامین لکھنے اور تقریری مباحثوں میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ اس سے مجھ کو احساس ہوا کہ مجھ میں زبان اور قلم سے کام لینے کی کچھ صلاحیت ہے۔ مدرسے کی زندگی میں چند مہینے ہی گذارنے کے بعد مجھے اس سے اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی کہ چھٹی کا دن مجھ کو سخت ناگوار ہوتا تھا۔ اور جب لمبی چھٹیاں آتی تھیں تو پہلے ہی سے ہم چند لڑکے آپس میں یہ پروگرام طے کر لیتے تھے کہ روزآنہ ایک جگہ جمع ہوا کریں گے۔ اور مل کر کچھ مطالعہ کیا کریں، اور مل کر تفریح بھی کریں گے۔

کھیل سے مجھے ابتدائی عمر میں بہت کم دلچسپی تھی۔ جب کچھ ہوش سنبھالا تو بنوٹ کے فن سے کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ میری والدہ صاحبہ کے خاندان میں یہ فن بہت مقبول تھا۔ خصوصاً میرے ماموں اس کے بہت ماہر تھے۔ میں نے اپنے خالہ زاد بھائیوں سے یہ فن سیکھا، اور کچھ مدت تک بس یہی میرا کھیل رہا۔ مدرسے میں داخل ہونے کے بعد مجھے فٹ بال اور کرکٹ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ مگر صرف تفریح کے لئے اس میں شریک ہوتا تھا۔ لیکن اچھا کھلاڑی میں کبھی نہیں بن سکا۔

میرا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جس میں تیرہ سو برس تک سلسلۂ ارشاد و ہدایات اور فقر و درویشی جاری رہا۔ سادات اہل بیت کی ایک شاخ تیسری صدی ہجری میں "ہرات" کے قریب ایک مقام پر آکر آباد ہوئی تھی جو "چشت" کے نام سے تمام دنیا میں مشہور ہوا۔

اس خاندان کے نامور بزرگ حضرت ابو احمد ابدال چشتیؒ (متوفی ۳۵۵ھ) حضرت حسن مثنیٰ بن حضرت امام حسن علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ انہی سے صوفیہ کا مشہور سلسلہ چشتیہ جاری ہوا ہے۔ ان کے نواسے اور جانشین حضرت ناصر الدین ابو یوسف چشتیؒ (متوفی ۴۵۹ھ) سادات کی ایک دوسری شاخ سے تعلق رکھتے تھے جس کا سلسلہ نسب امام علی نقی علیہ السلام کے واسطے سے امام حسین علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ حضرت ناصر الدین ابو یوسف کے فرزند اکبر حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ (متوفی ۵۲۷ھ) تھے جو تمام سلاسل چشتیہ ہند کے شیخ الشیوخ اور خاندان مودودیہ کے مورث ہیں۔

[حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کے شیخ
حضرت عثمان ہرونی تھے۔ ان کے شیخ حضرت
حاجی شریف زندنیؒ اور ان کے شیخ حضرت
خواجہ قطب الدین مودود رحمتہ اللہ علیہم]

خاندان مودودیہ کی جس شاخ سے میرا تعلق ہے وہ نویں صدی ہجری کے اواخر سے ہندوستان میں آباد ہے۔ اس شاخ کے پہلے بزرگ جنہوں نے ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کی حضرت ابو الاعلیٰ مودودی (المتوفی ۹۳۵ھ) تھے۔ وہ سکندر لودھی کے زمانہ میں چشت سے ہندوستان آئے اور کرنال کے قریب قصبہ براس میں مقیم ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں یہ خاندان مستقلاً دہلی میں آباد ہوا، اور اب تک ایک پانچ پشتیں گذر چکی ہیں، اور چھٹی پشت گذر رہی ہے۔ اسی اجڑے دیار میں آباد ہے۔

ننھیال کی طرف سے میں ترکی الاصل ہوں۔

میرے نانا مرزا قربان علی بیگ خان سالک اگرچہ خود شاعر اور صاحب قلم تھے۔ مگر پشتہا پشت سے ان کا پیشہ آبا سپہ گری تھا۔ ان کے بزرگوں میں سے مرزا طولک بیگ عالمگیر کے عہد میں ماوراءالنہر سے ہندوستان آئے اور فوجی مناصب سے سرفراز ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانے تک اس خاندان کے لوگ کسی نہ کسی طرح شاہی خدمت بجا لاتے رہے جب

شیرازۂ سلطنت درہم برہم ہوا تو مختلف افراد مختلف علاقوں میں تتر بتر ہو گئے۔ چنانچہ حضرت سالک مرحوم کے والد نواب عالم بیگ خان اور چچا نواب نیاز بہادر نواب میر نظام علی خان کے آخری عہد میں حیدرآباد آئے۔ نیاز بہادر خان کی شادی نواب مستقل جنگ عزت الدولہ عاشور بیگ خان کی صاحبزادی سے ہوئی۔ میر عاشور بیگ خان ان کے ہم جد اور رشتے داری میں ان کے چچا تھے، اور دولت آصفیہ نے اسی خطاب و اعزاز سے سرفراز کیا تھا۔ جو خطاب و اعزاز دولت مغلیہ کی جانب سے ان کے جد کو عطا کیا گیا تھا۔ نواب مستقل جنگ کے بعد نیاز بہادر خان ان کی جگہ نظم جمعیت کے جمعدار اور جاگیر کے مالک ہوئے۔

عالم بیگ خان کی شادی عبدالرحیم خان قلعہ دار گولکنڈہ کے خاندان میں ہوئی، اور انہی کے بطن سے حضرت سالک مرحوم پیدا ہوئے۔ ۱۲۳۲ھ میں نواب نیاز بہادر خان چپل گوڑہ کے ہنگامے میں شہید ہوئے۔ اس ہنگامے کے واقعات دکن کی تاریخوں میں تفصیل سے مذکور ہیں۔ اور شہادت کا یہ عجیب واقعہ لکھا ہے کہ "از شمشیر شمشیر خان کار نیاز بہادر خان او از شمشیر نیاز بہادر خان کار شمشیر خان تمام شد۔" اس واقعہ کے بعد نواب عالم بیگ خان اپنے خورد سال بچے کو لیکر دہلی واپس چلے گئے۔ اس کے تقریباً چالیس سال بعد مرزا سالک مرحوم پھر حیدرآباد واپس آئے اور سر سالار جنگ اعظم نے ان کو سررشتہ تعلیمات میں مامور کر دیا۔ یہاں انھوں نے نواب عماد الملک بلگرامی کی سرپرستی و شرکت سے "مخزن الفوائد" کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ جو اگرچہ حیدرآباد کا سب سے پہلا نہیں، تو کم از کم قدیم ترین علمی و ادبی رسالوں میں سے ایک ضرور تھا۔ ۱۸۸۰ء میں حضرت سالک نے انتقال فرمایا اور اسی خاک میں دفن ہوئے جہاں پیدا ہوئے تھے۔

میرے والد مرحوم، مولوی سید احمد حسن صاحب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے دو سال پہلے دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ مدرستہ العلوم علی گڑھ کے بالکل ابتدائی دور کے طالب

میں سے تھے۔ سرسید مرحوم نے جب مدرسۃ العلوم قائم کیا تھا تو وہ اپنے خاندان اور رشتے داروں میں سے بھی بہت سے لڑکوں کو چن کر علی گڑھ لے گئے تھے۔ چونکہ میری دادی صاحبہ مرحومہ سے ان کی قرابت ہوتی تھی۔ اس لئے میرے والد مرحوم کا انتخاب بھی اس سلسلے میں ہوا۔ مدرسہ میں سر راس مسعود وغیرہ اور سر بلند جنگ وغیرہ ان کے رفیق جماعت تھے۔ اس زمانے میں انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کے خلاف مسلمانوں میں جو شدید نفرت پھیلی ہوئی تھی اس کا حال سب جانتے ہیں۔ مگر ہمارا خاندان اس نفرت میں عام مسلمانوں سے بھی کچھ زیادہ بڑھا ہوا تھا کیونکہ یہاں مذہب کے ساتھ مذہبی پیشوائی بھی شامل تھی۔ میرے دادا صاحب کو والد کا علی گڑھ میں تعلیم پانا سخت ناگوار تھا، مگر سرسید کے خیال سے خاموش تھے۔ ایک مرتبہ ان کے ایک عزیز علی گڑھ تشریف لے گئے اور اتفاقاً ایک جگہ کرکٹ کا کھیل دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں انکی نظر والد مرحوم پر پڑی، اور یہ دیکھ کر انھیں سخت رنج ہوا کہ ایک پیرزادے کا لڑکا انگریزی لباس پہنے انگریزی طرز کا کھیل کھیل رہا ہے۔ دہلی واپس ہوئے تو دادا صاحب سے مل کر کہا کہ:

”بھائی صاحب! احمد حسن سے تو ہاتھ دھو بیٹھیں میں نے اس کو علی گڑھ میں دیکھا کہ کافر کرتی پہنے گیند بلا کھیل رہا تھا۔“

یہ سن کر دادا صاحب کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا، اور انھوں نے فوراً والد مرحوم کو علی گڑھ سے واپس بلا لیا۔ اس طرح وہ وہاں تکمیل تعلیم نہ کر سکے۔ اس کے بعد انھوں نے الہ آباد جا کر وکالت کی تعلیم حاصل کی پھر ریاست دیوگڑھ میں ولی عہد کے اتالیق مقرر ہوئے۔ اتالیقی کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ راجہ صاحب نے دہلی سے دو آدمیوں کو بلایا تھا تاکہ ان میں سے ایک کا انتخاب کریں۔ ان میں سے ایک میرے والد تھے۔ اور ایک والد مرحوم کے استاد تھے جنھوں نے بچپن میں ان کو پڑھایا تھا۔ دیوگڑھ پہنچ کر جب والد مرحوم کو معلوم ہوا کہ میرے استاد کو بھی بلایا گیا ہے تو انھوں نے راجہ صاحب سے کہلا بھیجا کہ میں اپنے استاد کے مقابلے میں شریک نہیں ہو سکتا۔ مجھے واپسی کی اجازت دی جائے۔ دوسری طرف استاد صاحب سے والد کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا کہ ”وہ میرا شاگرد اور میرے بیٹے کا بچہ ہے۔ بھلا وہ میرے مقابلہ میں کیا بڑھ جائے گا۔“ دونوں کے اخلاق کے یہ نمونے دیکھ کر راجہ صاحب نے کہا کہ ”ہمیں استاد کی ضرورت نہیں، شاگرد ہی ہمیں پسند آیا ہے۔“

کئی سال تک والد مرحوم دیوگڑھ میں رہے۔ پھر ایک سازش کے ماتحت ولی عہد کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا۔ جس کا والد مرحوم کو سخت صدمہ ہوا، اور دیوگڑھ کی ملازمت چھوڑ کر چلے آئے۔ پھر کئی سال تک انھوں نے میرٹھ، غازی آباد اور بلند شہر وغیرہ مقامات میں وکالت کی۔ اس کے بعد ۱۸۹۶ء میں ایک مقدمہ میں وکالۃً اورنگ آباد (دکن) تشریف لائے۔ یہاں مولوی محی الدین خاں صاحب صوبے کے میر عدل تھے، اور رشتے میں والد مرحوم کے چچا ہوتے تھے۔ ان کے اصرار سے یہاں وکالت شروع کر دی اور چند ماہ بعد بڑی تیزی سے کامیابی حاصل کی۔ اس زمانے تک والد مرحوم پر انگریزی خیالات اور انگریزی طرز معاشرت کا غلبہ تھا۔ اور مذہبیت کی چنگاری راکھ میں دبی ہوئی تھی۔ مولوی محی الدین خاں صاحب کی صحبت میں رفتہ رفتہ ان پر ایسا اثر کیا کہ فرنگیت کے تمام اثرات باطل ہو گئے، اور اسکی جگہ اسلامیت پوری طرح متمکن ہو گئی۔ ۱۳۱۸ھ میں والد مرحوم نے مولوی محی الدین خاں صاحب سے بیعت کر لی اور ذکر و شغل، ریاضات و مجاہدات اور سلوک و مراقبہ میں لگ گئے۔ تاہم اس وقت تک یہ رنگ اتنا نہ چڑھا تھا کہ وکالت کے ساتھ اس کا نباہنا مشکل ہوتا۔ چار سال تک دین و دنیا دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے مگر ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء میں جب کہ میں صرف ایک سال کا تھا۔ والد مرحوم کے لئے ان دونوں کا نباہنا مشکل ہو گیا اور انھوں

نے صرف وکالت بلکہ دنیا کمانے کی فکر ہی کو خیرباد کہا۔ تمام اثاث البیت تقسیم کر کے دہلی تشریف لے گئے اور درگاہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے قریب ایک قدیم بستی "عرب سرائے" میں اقامت گزیں ہو گئے، اور اپنا سارا وقت دینی مشاغل میں صرف کرنے لگے۔ جب تین سال اسی طرح زندگی بسر کرتے گذر گئے تو مولوی محی الدین خاں صاحب نے ان کو پھر اورنگ آباد طلب کیا اور نصیحت کی کہ رجوع الی اللہ کے لئے ترک دنیا لازم نہیں ہے۔ صرف یہ کوشش کرو کہ جو کچھ کماؤ جائز طریقے سے کماؤ۔ اس نصیحت پر عمل کر کے والد مرحوم نے پھر وکالت شروع کی۔ مگر اب یہ رنگ تھا کہ کوئی جھوٹا مقدمہ نہیں لیتے تھے۔ ہر موکل کو سب سے پہلے خود ان کی تحقیقات اور جرح و تنقید کے مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا جب انھیں کامل اطمینان ہو جاتا کہ اس کا معاملہ سچا ہے۔ تب کہیں اس کی وکالت کرنے پر راضی ہوتے۔ ان تقیدات کے ساتھ وکالت کا چلنا معلوم۔ رفتہ رفتہ اہل معاملہ کا رجوع ان کی طرف کم ہوتا چلا گیا۔ اور مالی مشکلات بڑھتی چلی گئیں مگر ان کے ساتھ مذہبی رنگ اور زیادہ گہرا ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ان کی ذہنیت، ان کے خیالات، ان کی معاشرت غرض ہر چیز اس قدر بدل گئی کہ یہ شبہ تک کرنے کی گنجائش باقی نہ رہی کہ ان کو کبھی انگریزی تعلیم اور انگریزی خیالات کی ہوا بھی لگی ہے ۱۹۱۵ء تک اورنگ آباد میں وکالت کرتے رہے۔ پھر حیدرآباد تشریف لائے مگر چند مہینے رہ کر خرابی صحت کے باعث بھوپال چلے گئے جہاں میرے بڑے بھائی سید ابو محمد صاحب اگزیکٹو افسر تھے وہاں ان پر فالج کا حملہ ہوا جس نے ان کو بالکل بیکار کر دیا۔ چار سال تک اسی مرض میں مبتلا رہ کر ۱۹۲۰ء میں انہوں نے انتقال فرمایا۔

میں ۳ رجب ۱۳۲۱ھ (ستمبر ۱۹۰۳ء) کو اورنگ آباد میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش سے تین سال پہلے ایک بزرگ والد مرحوم کے پاس آئے تھے۔ انہوں نے میری پیدائش کی پیش گوئی کی تھی اور والد سے فرمایا تھا کہ ان کا نام ابوالاعلیٰ رکھنا۔ چونکہ اس نام کے ایک بزرگ پہلے بھی ہمارے خاندان میں گذر چکے تھے۔ اور انھیں کی ذات سے ہندوستان میں ہمارے خاندان کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس لیئے والد نے ان کے ارشاد کو قبول کیا۔ اور یاد رکھا۔ چنانچہ جب میں پیدا ہوا تو اسی نام سے مجھے موسوم کیا گیا۔ میری پیدائش کے ایک سال بعد، جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں والد مرحوم نے دنیا ترک کر دی اور تین سال تک درویشانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ اس کے بعد گو انھوں نے پھر دنیا کی طرف رجوع کیا۔ مگر اس دنیا کی طرف نہیں جسے چھوڑا تھا۔ بلکہ ایک خالص مذہبی دنیا کی طرف۔ ان کی زندگی کے اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا وہ ایک مکمل مذہبی ماحول تھا۔ والد مرحوم اور والدہ ماجدہ دونوں کی زندگی ایک ہی مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ ان کی اس تربیت اور عملی نمونے کا یہ اثر تھا کہ ابتدا ہی سے میرے دل و دماغ پر مذہب کے گہرے نقوش مرتب ہو گئے۔

والد مرحوم نے اول دن تہیہ فرما لیا تھا کہ مجھے مولوی بنائیں گے۔ چنانچہ میری تعلیم بھی اسی ڈھنگ پر ہوئی۔ اردو اور فارسی کے ساتھ عربی زبان اور فقہ و حدیث کے درس پر ڈال دیا گیا، اور انگریزی زبان، علوم اور خیالات کی ہوا تک نہ لگنے دی گئی۔ والد مرحوم کو تعلیم کے ساتھ اخلاق و عادات کی اصلاح کا بھی خاص خیال تھا۔ ایک مدت تک انہوں نے مجھے کسی مدرسے میں داخل نہیں کیا۔ بلکہ گھر پر تعلیم دلوائی۔ پڑھنے کے علاوہ جتنے اوقات بچتے تھے۔ ان میں وہ بیشتر مجھ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اپنے احباب میں لے جاتے تھے، جو سب کے سب ثقہ اور سنجیدہ

لوگ تھے۔ راتوں کو انبیاء کے قصے، بزرگان دین کے حالات اسلامی تاریخ کی کہانیاں سناتے۔ مختلف دلچسپ پیرایوں میں اسلامی عقائد ذہن نشین کراتے اور مذہبی رنگ چڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ عام نشست و برخاست میں بھی تہذیب اخلاق و تہذیب کی اصلاح کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ زبان کی طرف بھی ان کی خاص توجہ تھی۔ بیس سال تک دکن میں رہنے کے باوجود ان کی زبان پر یہاں کا ایک لفظ اور ایک محاورہ بھی نہ چڑھا تھا۔ خالص اردو کے معلیٰ بولتے تھے اور زبان کی حفاظت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اس وجہ سے بھی انہوں نے ایک کافی مدت تک اس کا خیال رکھا کہ ہم عام نچوں میں ملنے جلنے نہ پائیں اور اس حفاظت کے باوجود اگر کبھی گھر کے نوکروں یا دوسرے لوگوں سے سنا سنایا کوئی دکنی لفظ یا محاورہ زبان پر چڑھ جاتا تو وہ فوراً ٹوک دیتے تھے اور صحیح لفظ بتادیا کرتے تھے۔

نو سال کی عمر تک میں نے گھر پر پڑھا اور اس زمانے میں صرف و نحو عربی ادب و فقہ کی متعدد ابتدائی کتابیں پڑھ لیں۔ پھر میرے استاد مولوی ندیم اللہ حسینی مرحوم و مغفور کے مشورے سے مجھے مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد کی جماعت رشدیہ میں داخل کر دیا گیا۔ داخلے کے چند مہینے بعد میں رشدیہ کے امتحان میں شریک ہوا مگر ناکام رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے ریاضی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور درسیات کی تعلیم بھی میں نے صرف اسی چھ مہینے کی مدت میں حاصل کی تھی۔ اس کے سوا کسی اور مضمون میں میں کمزور نہ تھا۔ اسی وجہ سے صدر مدرس ملا داؤد صاحب نے جو ابتدا سے مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے، میری ناکامی کے باوجود مجھے جماعت مولوی میں شریک کر لیا یہاں پہلی مرتبہ میں جدید علوم سے روشناس ہوا۔ گو ذریعہ تعلیم اردو تھی مگر کیمیا، طبیعیات، ریاضی اور تاریخ وغیرہ علوم سے واقفیت اور دلچسپی کی ابتدا ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی مختلف اساتذہ کے اثرات سے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی اور مدرسے کے دوستوں کے ساتھ میل جول نے اس رکھائی اور اکھڑ کھردرے پن کو دور کر دیا جو ابتدا اور سوسائٹی سے الگ تھلگ رہنے کے بدولت پیدا ہو گئی تھی مگر اتنے دنوں الگ رہنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ میں سوسائٹی میں اس وقت شامل ہوا جب کافی ہوشیار ہو چکا تھا والد مرحوم کی صحبت اور تلقین و تربیت سے مجھ میں برے اور بھلے کی تمیز ہو چکی تھی اور ان کی ابتدائی تربیت نے ایک ایسی سیرت کی بنیادیں مضبوط کر دی تھیں جو دوسروں کے اثرات کو بلا امتیاز اور بلا ارادہ قبول نہ کر سکتی تھی۔ اس کا فائدہ مجھے چند سال بعد محسوس ہوا جب میں اپنی زندگی میں کلیتاً آزاد و خود مختار ہو گیا اور کوئی سر دھرا نگرانی کرنے والا نہ رہا۔ اس وقت صرف یہی چیز تھی جس نے مجھ کو گمراہ ہونے سے بچایا۔ حالانکہ جب میں آزاد ہوا تھا اس وقت میری عمر صرف پندرہ سال کی تھی جس میں عام طور پر نوجوانوں کے لئے گمراہی کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔

بقیہ دل کی پکار

تھے مسجد کے اندر غنڈہ گردی میں تبلیغی جماعت جمعیۃ العلماء اور کانگریس (آئی) کے افراد پیش پیش تھے۔

امید ہے انجمن کی ہنگامی میٹنگ کے فیصلے کے بموجب "حیات نو" کا اگلا شمارہ مولانا مرحوم کی حیات و خدمات پر مشتمل ہوگا۔ اور حتی الوسع زیادہ سے زیادہ معیاری بنانے کی کوشش کریں گے اور جہاں تک ممکن ہو سکے ضخامت میں اضافہ کر کے مولانا کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا جائے۔ بہی خواہوں کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔

فقط
والسلام
خیر اندیش
شفیق عالم
8-10-79

مولانا نظام الدین اصلاحی

تحریکِ اسلامی کی تشکیل اور مولانا مودودیؒ

مولانا مودودی ذہین اور صاحب طرز انشا پرداز تو تھے ہی ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ماضی وحال کا گہرا مطالعہ کرکے مستقبل میں رونما ہونے والے حالات کا جائزہ لیتے تھے چنانچہ انھوں نے بہت سے سیاسی معاملات میں مستقبل کی نشاندہی کی ہے ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۵ء تک ہندوستان میں خلافت تحریک کا بہت زور تھا انگریزوں نے ترکی میں اسلامی خلافت کا خاتمہ کرکے قومی اسٹیٹ کی بنیاد ڈالی ترکی کے مسلمانوں نے اس پر احتجاج کیا چونکہ ہندوستان میں بھی انگریزوں ہی کی حکومت تھی اس لئے ہندوستانی مسلمانوں نے اسلام کے عالمی رشتہ اخوت کی بنا پر ترکی مسلمانوں کا ساتھ دینا ضروری سمجھا چنانچہ ہندوستان میں مولانا محمد علی جوہر و مولانا شوکت علی (علی برادران) نے خلافت تحریک کی بنیاد ڈالی اور اپنی شعلہ بیانی اور جرأت وہمت سے پورے ہندوستان میں اسلامی خلافت کی لہر دوڑا دی اس جذباتی تحریک کے اندر مسلمان یدخلون فی دین اللہ افواجا کا منظر پیش کر رہے تھے یہاں تک کہ مسلمانوں کا دل جیتنے کے لئے اور ان کو اپنے مطلب کے لئے استعمال کرنے کے لئے ہندو لیڈروں نے بھی ان کا ساتھ دینا ضروری سمجھا اس میدان میں گاندھی جی آگے آگے تھے خلافت تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان انگریزوں سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ ترکی میں خلافت کو زندہ کریں اس مقصد کی راہ میں مسلمانوں کی جانی و مالی قربانیاں اتنی عظیم ہیں کہ تاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کے دیہات دیہات اس تحریک سے متاثر ہو گئے بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ترکی ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان میں بھی تحریک کا سیل رواں انگریزی اقتدار کو خس وخاشاک کی طرح بہالے جائے گا اس وقت مولانا مودودی کی عمر مشکل سے ۲۰ برس تھی مگر مستقبل کا لکھا پڑھ رہے تھے مولانا نے اس وقت لکھا جس کا مفہوم یہ تھا۔

"اگر ترکی کے حکمران خود خلافت اسلامیہ کو خیرباد کہہ دیں گے تو پھر ہندوستانی مسلمانوں کی قربانیوں کا کیا حشر ہوگا"

چنانچہ یہی ہوا کہ یہاں ہندوستان میں بیٹھ کر یہاں کے مسلمان بیرونی دنیا میں خلافت قائم کر رہے تھے اور خود وہاں کے مسلم حکمرانوں نے خلافت کو ناقابل عمل قرار دے کر ٹھکرا دیا اور اس طرح اس پوری تحریک کی عمارت دھڑام سے نیچے آ رہی اسی زمانہ میں مولانا محمد علی چھندواڑہ شہر کے پرفضا مقام میں نظربند تھے اور جب وہاں سے رہا ہوئے تو معلوم ہوا کہ پیروں کے نیچے سے زمین کھسک چکی ہے مگر اس ہونے والے حادثے کی نشاندہی ایک ۲۰ سالہ نوجوان نے پہلے ہی کر دی تھی اسی زمانے سے مولانا کی بے مثال ذہانت اور دور اندیشی معروف ہونے لگی تھی۔

اس حادثے کے فوراً بعد ہندوستان میں شدھی

تحریک کا طوفان اٹھا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان جو ہندو تھے اس لئے ان کو پاک صاف (شدھی) کر کے دوبارہ ہندو بنایا جائے۔ اس تحریک کا روح رواں سوامی شردھانند تھا بہت سے علاقوں کے جاہل مسلمان مرتد بھی ہونے لگے اس ہیبتناک منظر کی تاب نہ لا کر قاضی عبدالرشید نامی ایک شخص نے سوامی شردھانند کو قتل کر دیا یہ حادثہ ہونا تھا کہ پورے ہندوستان میں اسلام کے خلاف جا بجا پروپیگنڈے کا سلسلہ شروع ہو گیا خاص طور سے اسلام کے نظریہ جہاد کے خلاف سخت پروپیگنڈہ ہوا یہاں تک کہ گاندھی جیسے ٹھنڈے انسان نے بھی اس مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ یہاں تک کہہ دیا

"بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے"

مولانا محمد علی مرحوم سے یہ واقعہ دیکھا نہ گیا جامع مسجد دہلی میں انھوں نے مسلمانوں کے مجمع عام میں ایک پرجوش تقریر کی اور کہا۔

"کاش کوئی حساس مسلمان اسلام کے نظریہ جہاد پر سے غلط فہمیوں کے پردے چاک کر دیتا"

اس جلسے میں یہ نوجوان موجود تھا جو بعد میں مولانا مودودی کے نام سے مشہور ہوا بس یہ واقعہ الجہاد فی الاسلام جیسی معرکۃ الآراء تصنیف کے وجود میں آنے کا محرک بن گیا جس کے کتاب کے بارے میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا تھا کہ اردو ادب کے اندر یہ پہلی تصنیف ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اسلام کے نظریہ جہاد پر معذرت خواہانہ و مدافعانہ انداز اختیار نہیں کیا گیا ہے۔

تشکیل جماعت کا محرک سنہ ۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے جب مولانا روزنامہ الجمعیۃ دہلی کے چیف ایڈیٹر تھے اور اسی زمانہ میں جہاد پر کتاب لکھی لیکن خود مولانا کا کہنا ہے کہ جہاد پر مطالعہ میں جتنی وسعت پیدا ہوتی گئی اسلام کے فہم و ادراک میں بھی اسی قدر وسعت پیدا ہوتی چلی گئی بالآخر اسی دور میں ذہن میں مکمل اسلامی نظام کا تصور پیدا ہوا اور آئندہ کا نقشہ کار ذہن میں مرتب ہونا شروع ہوا پھر مولانا نے مسلمانوں کی تاریخ کا بھی گہری نظر سے جائزہ لیا اور یہ دیکھا کہ ان کی تحریکات زیادہ تر جذباتی اور ہنگامی ہوتی ہیں اور چند ہی سالوں میں پسپا ہو کر ناکامی کے گڑھے میں جا گرتی ہیں ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت بھی ہنگامہ پسندی کا شکار ہو گئی، ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت بھی جذبتیت اور غفلت پسندی کی بنا پر ناکامی کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی جس کی وجہ سے ملت اسلامیہ میں ہر طرف مایوسی نا امیدی عام تھی اور ہندوستان کی ہندو اکثریت اپنے روشن مستقبل کا پلان تیار کر رہی تھی گاندھی اور نہرو جیسی مضبوط اور ٹھنڈی قیادت یہاں کی اکثریت کو مضبوطی میں جکڑے ہوئے تھی لیکن مسلمانوں کی قیادت کبھی کانگریس میں شامل ہوتی کبھی اس سے نکل کر کسی جذباتی تحریک کی داغ بیل ڈالنے کی فکر کرنے لگ جاتی یہاں تک کہ مسلم قیادت نے اپنی سطحیت کی بنا پر "متحدہ قومیت" جیسا غیر اسلامی نظریہ بھی اپنا لیا اور اس کیلئے قرآن و حدیث سے من گھڑت دلائل پیش کرنے شروع کر دئے۔ مولانا نے انھیں دنوں یہ محسوس کیا کہ اگر مسلمانوں کا یہی حال رہا تو مستقبل میں اتنے بڑے خسارے سے دوچار ہونگے جو ماضی کی تمام ناکامیوں کو پیچھے چھوڑ دے گا۔ ہندوستان کی آزادی سامنے نظر آرہی تھی آزاد ہندوستان میں غیر منظم ملت اور ہنگامہ پسند قوم کا کیا بنے گا اس کا واضح نقشہ مولانا نے پیش کیا اور اپنے طور پر یہ طے کر لیا کہ ایک منظم جماعت اور ٹھنڈی قیادت ملت کو فراہم کی جائے۔

یہ پہلا محرک تھا جس کی بنا پر مولانا نے جماعت اسلامی نامی تحریک کو منظم کرنے کا فیصلہ کیا۔

دوسرا محرک مولانا نے آزادی ہند سے پہلے ہی یہ

پیشین گوئی کی کہ ہندوستان جلد آزاد ہو جائے گا اور یہاں کا مستقبل ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ان کے دین و مذہب کے لئے اور انکی تہذیب و تمدن کے لئے نئے مسائل پیدا کر دے گا ان سے نبرد آزما ہونا آسان نہ ہوگا اس لئے ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو ایک منظم با اصول اور اسلامی جماعت کی شکل میں ابھرنا چاہیے چنانچہ اس وجہ سے بھی مولانا نے ضروری سمجھا کہ ایک جماعت تشکیل دی جائے یہ دوسرا محرک تھا جسکی نشاندہی مولانا نے اپنے ایک خط میں بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں

"مجھے تقسیم سے پہلے ہی ان حالات کا اندازہ تھا جو اب آپ کے سامنے آرہے ہیں اسی بنا پر میں نے لیگ میں شرکت سے پرہیز کر کے جماعت اسلامی کو منظم کیا تھا تاکہ آگے ہندوستان و پاکستان میں جو حالات پیش آتے نظر آرہے تھے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک منظم جماعت تیار رہے اس وقت بہت سے مسلم لیگی حضرات مجھ سے ناراض تھے اور اب بھی بہت سے ناراض ہیں لیکن میں نے اس وقت بھی اپنا فرض انجام دیا تھا اور اب بھی انجام دے رہا ہوں ......" مکاتیب مودودی حصہ دوم صفحہ ۲

مولانا نے ہندوستان کے مستقبل کا جو نقشہ کھینچا تھا کوئی غیر جانبدار قاری اس پر داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا حقیقت یہ ہے کہ اگر آج یہ جماعت ہندوستان و پاکستان میں موجود نہ ہوتی تو پاکستان کو اشتراکی نظریہ زندگی سے اور ہندوستانی مسلمانوں کو لادینی نظام تعلیم اور ارتداد سے کوئی طاقت بچا نہ سکتی تھی حالات پر گہری نظر رکھنے والے منصف مزاج مبصرین اس کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

تشکیل جماعت سے پہلے

مولانا نے تشکیل جماعت سے پہلے یہ ضروری خیال کیا کہ کسی نئی جماعت کی بنیاد ڈالنے سے پیشتر موجود جماعتوں کی طرف رجوع کیا جائے اور انھیں اسلام کا عالمگیر پیغام بتا کر اس مقصد کی طرف متوجہ کیا جائے مولانا چاہتے تھے کہ نئی تنظیم کا جو نقشہ کار ان کے ذہن میں ہے اسے کوئی مسلم جماعت اپنا لے تاکہ نئی جماعت کی تشکیل کی ضرورت پیش نہ آئے اور مولانا خود اس میں شامل ہوں۔ اس سلسلہ میں مولانا نے سب سے پہلے تبلیغی جماعت کے بانی مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں حاضری دی اور ان کے پاس کچھ دنوں قیام کر کے تبلیغی جماعت کو قریب سے دیکھا مولانا الیاس صاحب سے تبادلہ خیال کیا اور اپنا نقشہ کار بھی ان کے سامنے پیش کیا مولانا نے مودودی صاحب کی ہمت افزائی فرمائی اور فرمایا کہ آپ اپنے نقشہ کار کے مطابق کام کریں اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ مولانا الیاس صاحب مرحوم نے فرمایا تھا کہ عام طور سے لوگ جس کام کو ایک ہفتہ میں کرتے ہیں مودودی اس کو ایک دن میں کر لیتا ہے مولانا مودودی اسی زمانے میں بعض جلسوں میں بھی شریک ہوئے اور اس کام سے غیر مطمئن ہو کر واپس آئے پھر جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ کے ذمہ داروں کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا لیکن اس وقت کی ہنگامہ خیز سیاست اور جنگ آزادی کی ہماہمی نے کسی کو اس سنجیدہ مسئلہ پر سوچنے تک کی فرصت نہ دی بالآخر ۱۹۴۱ء میں پہلی مرتبہ تشکیل جماعت کا فیصلہ کیا اور اپنے نقشہ کار کے مطابق مولانا نے باقاعدہ جماعت بنائی اور کام کی داغ بیل ڈال دی۔

تشکیل جماعت سے پہلے دوسرا اہم کام رسالہ "ترجمان القرآن" کا اجرا تھا یہ رسالہ ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد سے جاری کیا گیا اس کے ذریعہ تحریک اسلامی کا نقشہ کار عام قارئین کے سامنے پیش کیا

جاتا۔ ذہنوں کی تعمیر میں اس رسالہ نے اہم رول ادا کیا تھا۔ رسالے نے سرزمین ہندوستان کے اندر ایک اچھے خاصے ذہین طبقہ کو متاثر کیا اور ان کے دلوں کو تحریک اقامت دین کے کام کے لیے گرمایا۔ اصلاً یہ ۸ سال کا وقت جو ۳۳ء سے شروع ہو کر ۴۱ء تک پہنچتا ہے تحریک کے لیے زمین تیار کرنے کا وقت تھا مولانا کا نقشہ ہی یہ تھا کہ جب تک زمین اچھی طرح تیار نہ ہو جائے اور مناسب موسم سامنے نہ دے بیج بونا دانشمندی کی بات نہ ہوگی جب یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا تو مولانا نے لوگوں کو عملی اقدام کے لیے متوجہ کیا۔

دستور سازی

تشکیل جماعت سے پہلے مولانا نے دستور مرتب کیا اور اسے اپنے عقیدت مندوں تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ غایت احتیاط کی وجہ سے اسے ملک کے تمام اہل دانش، علماء اور عربی مدارس کے ذمہ داروں تک روانہ فرمایا اور سب لوگوں سے اس کے بارے میں رائے طلب کی خاص طور سے اسکی غلطیوں پر نشاندہی کرنے کی درخواست کی علماء نے اس دستور پر موافقانہ ردعمل ظاہر فرمایا عقیدہ کی دفعات پر جس میں شق ۳ بھی ہے کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ اسے عقیدہ اسلامی کے عین مطابق قرار دیا یہی وہ دفعہ ہے جس پر علماء دیوبند نے مخالفتوں کا طوفان برپا کیا تھا دستور کے بارے میں لوگوں کی رائیں موصول ہو جانے کے بعد مولانا نے پورے اطمینان کے ساتھ تشکیل جماعت کا اعلان فرمایا۔

نمایاں خصوصیتیں

مولانا کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ کوئی اہم قدم اٹھانے سے پہلے کافی غور و فکر کرتے اور قدم اٹھا دینے کے بعد پھر حالات کتنے ہی ناسازگار ہوں پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے تشکیل جماعت کا فیصلہ بھی اس کی واضح مثال ہے اس راہ میں مولانا نے جو قدم رکھا تو مستقبل کے سارے خطرات کا خوب اندازہ کر لیا اور اپنے متبعین کو بھی سمجھا دیا اور ان سارے خطرات کو زندگی بھر خود جھیلتے رہے اور رفقاء کار کو مصائب جھیل جانے کی تلقین کرتے رہے اپنوں کی مخالفت، اغیار کے حملے باطل کی یلغار اور حاکم وقت کی ناراضگی سب نے راہ روکنے کی کوشش کی مگر مولانا کوہ گراں کے مانند اپنی جگہ پر کھڑے رہے طوفان نے اپنا راستہ بدل دیا لیکن مولانا کو راستہ بدلنے پر مجبور نہ کر سکا۔ آخری آزمائش جان کی آزمائش تھی پھانسی کی سزا سن کر بھی ایک لمحہ کے لیے کبیدہ خاطر نہ ہوئے اور فرمایا کہ

"اگر اللہ تعالیٰ کو میری زندگی مطلوب نہیں تو یہ ہوگا اور اگر میری زندگی مطلوب ہے تو یہ لوگ چاہے الٹے لٹک جائیں مجھے پھانسی پر لٹکا نہیں سکتے"

کسی بھی تحریک کے بار آور ہونے کے لیے یہ خوبی بنیادی حیثیت رکھتی ہے اسی خوبی کی وجہ سے مولانا نے اس تحریک کو کامیابی کی منزل کے قریب پہنچایا

مولانا کی دوسری خصوصیت ان کی بے پناہ قوت کارکردگی تھی جس کا اعتراف مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کیا اور مرحوم کی پوری زندگی اس کا ثبوت ہے مولانا نے ایک ہی وقت میں تحریک کی قیادت بھی کی اور ملک و ملت کی سیاسی رہنمائی بھی کی اور اسی وقت اعلیٰ تصنیفی خدمات بھی انجام دیں۔ کسی انسان میں ان دونوں صلاحیتوں کا پایا جانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو ان کی اعلیٰ خدمات پر اجر عظیم عطا فرمائے اور جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام سے سرفراز فرمائے۔ آمین

انصار احمد فلاحی (سکریٹری انجمن طلبۂ قدیم)

خدا بخشے، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

۱۔ مولانا مرحوم کا اولین کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایسے وقت میں جبکہ مغربی افکار و نظریات کا امت مسلمہ پر زبردست غلبہ و استیلا تھا بلکہ امت کے گل سرسبد کہلانے والے علماء تک اس کی یلغار کے آگے بے بسی محسوس کر رہے تھے۔ بعض مصنفین نے تو اسلام اور اسلامی تعلیمات کا کھلے عام مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا۔ اشتراکیت کا طلسم نوجوانوں کو مسحور کئے ہوئے تھا۔ اور محسوس یہ ہو رہا تھا کہ یہ پوری طرح امت کو اپنے شکنجے میں جکڑ لے گا۔ مسلمانوں کے اکابر کے ذہنوں میں چاہے اسلام ایک مکمل نظام کا تصور رہا ہو مگر اسے واشگاف انداز میں پیش کرنے کی جرأت کسی کو نہیں ہو رہی تھی۔ ایسے نازک اور کٹھن حالات میں مولانا مرحوم نے مغرب کے فلسفہ پر بھرپور تنقید کی۔ مسلمانوں کے ذہنوں کی مرعوبیت کو ختم کرنے کے لئے ترجمان القرآن جاری کیا۔ اسلام کا واضح اور ہمہ گیر تصور پیش کیا۔ مولانا کے لب و لہجہ میں اول دن ہی سے یقین کی پختگی، تحریر میں فکر و نظر کی گہرائی اور استدلال میں ذہنوں کو مسخر کر لینے والی صلاحیت موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی تحریروں نے بہت جلد جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اپنا مقام بنا لیا اور مغرب کے ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ مولانا کا یہ تو زبردست کارنامہ ہے جو تاریخ کے اوراق میں سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔

۲۔ مولانا محترم کی دوسری خوبی ان کی غیرت حق ہے۔ وہ حد درجہ خوددار تھے۔ بڑی سے بڑی آزمائش نے ان کی غیرت ایمانی کو چیلنج کرنا چاہا مگر وہ صبر و استقامت کا پہاڑ ثابت ہوئے۔ آپ کی زندگی کے بے شمار واقعات بین ثبوت ہیں۔ ترجمان القرآن کو جب مولانا نے نکالنا شروع کیا تو ریاست حیدرآباد اس کے ڈیڑھ سو پرچے خرید کر ریاستی اسکولوں میں بھیجتی تھی۔ اسی زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کی پروفیسری آپ کے سامنے پیش کی گئی۔ یونیورسٹی کافی بڑی رقم معاوضے کے طور پر پیش کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں آپ کے بڑے بھائی نے بھی بہت زور دیا اور کہا کہ اس طرح ترجمان القرآن کی مالی مشکلات بھی دور ہو جائیں گی۔ مگر پروفیسری قبول کرنے کے معنی یہ تھی کہ والئ ریاست میر عثمان علی خاں کے سامنے حاضری دینی پڑتی اور حاضری کی شکل یہ تھی کہ کوٹھی کے پہلے کمرے میں حاضری دینے والے کی کمر میں پٹکا باندھا جاتا تھا جو اطاعت و فرمانبرداری کی علامت ہوتا تھا اس کے بعد دوسرے کمرے میں نظام

حیدرآباد کو ... سلام پیش کیا جائے جہاں پر کہ وہ موجود نہیں۔ پھر ... میں والیٔ حیدرآباد موجود ہوتا تھا وہاں جھکنے کے بعد سلام نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس وقت تک بیٹھنا منع تھا جب تک کہ نظام کی طرف سے بیٹھنے کی اجازت نہ مل جائے بیٹھنے کی ہیئت وہ ہوتی تھی جو تشہد میں خدا کے سامنے ہوتی ہے۔ خاموش سر جھکائے بیٹھنا پڑتا تھا۔ گفتگو میں پہل کرنا جرم تھا اور سر جھکائے ہوئے جواب دینا ہوتا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے کسی بھی عہدہ کو قبول کرنے کے لئے یہ تمام مراسم ادا کرنے لازمی تھے۔ لیکن مولانا کی غیرت یہ سب کچھ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے مستقبل سے بے خوف ہو کر اپنی عسرت اور تنگی کے باوجود اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور بڑے درد مندانہ انداز سے اپنے بھائی سے کہا۔

> حالات بہت نازک ہیں اور مسلمانوں کو ایک بہت بڑا خطرہ درپیش ہے جو انگریزوں کی غلامی سے بھی زیادہ مہلک اور خطرناک ہے مسلمانوں کو اس کی طرف سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ اپنی ہمت کے مطابق ان کی کچھ نہ کچھ خدمت کرنے کی کوشش کروں گا۔

نتیجۃً نظام حیدرآباد نے خفا ہو کر ترجمان کے ڈیڑھ سو پرچوں کی خریداری بند کر دی جس کی وجہ سے مشکلات میں مزید اضافہ ہو گیا۔ مگر مولانا ایک لمحہ کیلئے بھی ہراساں و پریشان نہیں ہوئے۔

۳۔ علامہ اقبال مرحوم کی دعوت پر جب مولانا حیدرآباد سے پنجاب منتقل ہوئے اور دعوت پر منظم کرنا شروع کیا تو آپ نے حیدرآباد کے مقابلہ میں اپنا معیار زندگی کئی گنا گھٹا دیا۔ حیدرآباد میں شہری زندگی ہونے کی وجہ سے کافی سہولتیں میسر تھیں بہت ہی آرام کی زندگی تھی لیکن آپ کے سامنے اسلام کی سچی خدمت اور اس کی سربلندی تھی۔ اور آپ نے محسوس کیا کہ اس سے کہیں گنا زیادہ کام دارالاسلام (پٹھان کوٹ) کے ویرانہ اور پتھریلے میدان میں کیا جا سکتا ہے تو آپ نے شہری زندگی کو بخوشی ترک کر دیا اور دارالاسلام جو آبادی سے دور ایک ویرانہ تھا منتقل ہو گئے جہاں پر نہ تو روشنی تھی اور نہ ہی دوسری آسائش کے سامان۔ اس موقع پر جن لوگوں کو آپ کی رفاقت میں کچھ کام یا کچھ ایام گذارنے کا موقع ملا ہے ان کا بیان ہے کہ مولانا کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانا پڑتا تھا پھر خود ہی کلہاڑی سے ان کو پھاڑتے بھی تھے۔ کنوئیں سے پانی بھی خود ہی بھرنا پڑتا تھا۔ مختصر راہ خدا میں یہ سختیاں اور پریشانیاں بہت ہی معمولی تھیں۔ لیکن ایسی پریشانیوں کو مولانا کب خاطر میں لانے والے تھے۔ اولو العزمی اور بلند ہمتی کی جو مثال مولانا نے پیش کی ہے تاریخ کے اس دور میں اس کی دور دور تک مثال نہیں ملتی ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان کے ایک سالانہ اجتماع میں جب چند غنڈوں نے حملہ کیا جس کی وجہ سے ایک کارکن اللہ بخش شہید ہو گئے۔ اس وقت مولانا تقریر کر رہے تھے گولیوں کی آواز سن کر کسی نے کہا مولانا بیٹھ جائیے مولانا نے جواب دیا کہ اگر اس وقت میں بیٹھ گیا تو پھر ان غنڈوں کے مقابلہ میں اس ملک میں کھڑا کون رہے گا۔

غرض سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے پوری جرأت کے ساتھ تقریر کو جاری رکھا۔

گولیاں چلتی رہیں اور فرض ادا ہوتا رہا

۴۔ تقسیم ہند کے موقع پر پنجاب دہلی وغیرہ میں سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں پر بڑے پیمانے پر حملے شروع کئے اس وقت سید مودودیؒ نے دارالاسلام میں بھی مسلمانوں کے لئے ایک کیمپ قائم کئے جہاں آس پاس کے مسلمانوں نے پناہ گزینی شروع کر دی جو چار ہزار سے کم نہ تھے۔ ان کی حفاظت اور خورد و نوش کا انتظام مولانا کی قیادت میں کیا گیا۔ ان ایام میں مولانا مرحوم بالکل نہیں سو پاتے یا سوتے بھی تو چند گھنٹوں کے لئے راتوں کو فوجی لباس پہن کر بندوق لئے

ہوئے دارالاسلام کی عمارت کے گرد پہرہ دیتے۔ کیمپ کی تمام عورتوں کو بیچ کے ایک مکان میں رکھا اور جس طرف سے سکھوں اور ہندوؤں کے حملے کا زیادہ امکان تھا اس طرف خندق کھدائی عورتوں کو ہدایت کردی تھی کہ اگر لڑائی آجائیں تو لڑتے ہوئے جان دیدینا مگر خودکشی کی بات ہرگز مت سوچنا۔ چودہ پندرہ دن تک مولانا نے جس قیادت کا مظاہرہ کیا دیکھنے والوں کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ مولانا صرف قلم ہی کے مجاہد نہیں ہیں بلکہ مولانا فوجی نوعیت کی بھی قیادت کرسکتے ہیں۔ ایک دن ایسا ہوا کہ پاکستانی حکومت نے ایک اعلیٰ پولیس افسر کو ایک جیپ اور مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ دے کر پٹھان کوٹ بھیجا کہ وہ مولانا کو اور ان کے خاندان کو وہاں سے نکال لائے لیکن مودودی صاحب نے انکار کردیا اور کہا کہ پہلے یہ مسلمان پناہ گزیں جائیں گے پھر ہمارے رفقاء جائیں گے۔ اور بعد میں میں اور میرے خاندان کے لوگ جائیں گے چنانچہ حکومت کے اصرار پر مولانا کا اصرار غالب آیا۔ لاہور پہنچنے کے بعد حکومت کے مہیا کردہ چھولداریوں میں اپنے خاندان اور رفقاء کے گھر والوں کو ٹھہرایا اور پھر فوراً مہاجرین کے سب سے بڑے کیمپ کے دیکھ بھال کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور اس طرح خدمت خلق کا کام بڑی ہی جانفشانی سے انجام دیا۔ اس موقع پر اگر کوئی دوسرا ہوتا تو سب سے پہلے اپنے گھر والوں کے لئے مکان الاٹمنٹ کئے جانے کی درخواست دیتا۔

۵۔ مولانا کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی تھی کہ وہ علم و عرفاں کا ہمالیہ ہونے کے باوجود کبھی بھی اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھا۔ اہل علم کی مجلسوں میں بیٹھتے تو کبھی بھی عام علماء کی طرح اپنی ہمہ دانی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے بلکہ جب اہل علم اور اہل فکر کسی موضوع پر گفتگو کرتے تو آپ ایک طالب علم کی طرح نہایت خاموشی کے ساتھ غور سے سنتے تھے اور جب دوسرا بولنے لگتا تھا تو اس کی طرف رخ کرلیتے تھے پھر جب آپ کی باری آتی تو نہایت مرتب انداز سے محکم دلائل کے ساتھ گفتگو کرتے اور اس وقت لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس مفکر کے آگے کچھ بھی نہیں ہیں۔ لوگوں نے یہ مشاہدہ مولانا کی نجی مجلسوں میں بھی کیا ہے اور بڑی بڑی کانفرنسوں میں بھی کیا۔

۶۔ مولانا مرحوم جماعت اسلامی کے بانی اور داعی ہیں اور آخری چند سالوں کو چھوڑ کر ہمیشہ جماعت کے امیر بھی رہے ہیں۔ ان پورے ایام میں مولانا نے کبھی بھی تحکمانہ اور آمرانہ انداز سے اپنے کسی حکم کو جماعت یا جماعت کے کسی رکن پر نافذ نہیں کیا۔ ایسا کرنے کے بجائے وہ اپنے فیصلوں پر سوچی سمجھی آراء کو ہمیشہ مشفقانہ نصائح اور دوستانہ مشورے کی شکل میں پیش کرتے تھے اور دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دوسری طرف آپ کی شفقت و محبت کا ارکان جماعت پر اتنا گہرا اثر تھا کہ انھوں نے آپ کے مشوروں کو بہت احترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھا اسے بلاوجہ کبھی نظر انداز نہیں کیا۔

رسالے کے کچھ مضامین اس میں شائع ہونے سے رہ گئے ہیں۔ چونکہ بہت جلدی میں اس کی کتابت و طباعت ہوئی اور رسالے کے اپنے وقت سے بہت ہی تاخیر کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش ہونے کے خوف نیز جگہ کی قلت کی بناء پر اُن مضامین کو اس میں شامل نہیں کیا جاسکا ہے ان شاء اللہ اگلے شمارہ میں وہ مضامین آپ کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے۔

سوگوار ماں اور غمزدہ بیٹے کا ٹیلی فون پر مکالمہ

۲۳ ستمبر، اتوار۔

صبح سحری کے وقت ۴۲-۴ پر۔

بیگم صاحبہ: یہاں اللہ کا شکر ہے تم سناؤ کیا حال ہے بیٹے؟

حیدر اماں یہ کیا ہوگیا۔

بیگم صاحبہ: بیٹے! جو اللہ کی مرضی تھی وہی ہوا۔ وہی ہو کر رہتا ہے کوئی بھی یہاں ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے نہیں آیا ہے جو بھی آیا ہے زندہ رہنے کے لئے نہیں آیا۔ بیٹا! سب کو جانا ہے، بیٹا سب کو مرنا ہے، صبر کرو صبر......

حیدر: آپ ابا جان کو لے گئی تھیں کیا ہوگیا امی!

بیگم صاحبہ: بیٹے! تمہارے ابا کو ساتھ ہی لا رہی ہوں جو بھی دنیا میں آیا ہے اسے ایک روز مرنا ہے۔ اللہ سے دعا کرو۔ وقفہ میں نے اور تمہارے بھائی جان نے انھیں نہلا لیا ہے، تیار کر لیا ہے۔ کپڑے پہنا لئے بس AIR روٹ کا انتظار ہے۔

بیٹے! اسما بیٹی سے کہو موت برحق ہے۔ میں جانتی ہوں، وہ اپنے رب سے ملنے کیلئے سینکڑوں فرشتوں کے ہمراہ چلے گئے ہیں، سینکڑوں فرشتے ان کا استقبال کر رہے ہیں، تم پریشان مت ہو۔ اس دنیا کے لوگوں نے تمہارے ابا کی قدر نہیں پہچانی۔

حیدر: مگر اماں............

بیگم صاحبہ: بیٹے: موت یقینی ہے بس ہم لوگ اسے بھولے رہتے ہیں اسے بھولا نہ کرو، خدا کا شکر ادا کرو کہ وہ تمہیں چھوٹا چھوٹا چھوڑ کر نہیں گئے۔ تم ماشاء اللہ اب اپنے پاؤں پر کھڑے ہو۔ بیٹا! جس کی امانت تھی وہ لے گیا اس میں پریشانی کی کیا بات ہے.........

آسمان اصلاح و تجدید کے دو ستارے

عبید اللہ فہد جامعۃ الفلاح بلریا گنج

برصغیر میں چودھویں صدی کی دو شخصیتیں ایسی ہیں جنہوں نے اصلاح و تجدید کے میدان میں بے مثال کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ایک کا نام محمد الیاس تھا اور دوسری کا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ ایک نے جاہل اور ان پڑھ مسلمانوں کو دین سے روشناس کیا۔ اور دوسرے نے مغربی افکار و نظریہ ہائے حیات سے تعلیم یافتہ طبقہ کو پھر کر اسلام کی ڈگر پر ڈال دیا۔ ایک میدان تصوف و تبلیغ کا شہسوار اور وقت کا قلندر تھا۔ دوسرا میدان تحریک و قیادت کا مجاہد اور باطل طاقتوں کے لئے پیغام موت تھا۔ ایک کے یہاں فقر و فنا اور صدق و صفائی کی شان تھی۔ دوسرے کے یہاں جلال فاروقی اور عزم صدیقی کی آن بان تھی۔ کام دونوں کا ایک تھا۔ مگر کام کے میدان مختلف تھے ایک نے جاہل مسلمانوں کو اپنا نشانہ بنایا۔ اور دین کی ابتدائی تقاضوں کی تکمیل کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی۔ دوسرے نے غیر اسلامی افکار سے متاثر تعلیم یافتہ طبقہ اور نام نہاد مرعوب مسلمانوں کی مرعوبیت کو ختم کیا اور دین کو غالب و نافذ کرنے میں ان کی صلاحیتوں کو لگانے کی کوشش کی۔

مقصد ایک تھا۔ مقصد سے وابستگی اور نصب العین سے گہرا عشق دونوں کے یہاں برابر تھا۔ دونوں ایمان و یقین، عزم محکم، خلوص نیت اور جہد و سعی کی دولت سے مالا مال تھے۔ دونوں نے تن من دھن سے احیائے اسلام کی کوشش کی۔ مسلمانوں میں وحدت پیدا کرنی چاہی۔ انہیں ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے اور دین کی راہ میں ان کی صلاحیتوں کو کھپانے کی جد و جہد کی۔ دونوں آسمانی اصلاح و تجدید کے دو درخشاں ستارے علی الافق دو ماہتاب تھے۔ ایک کے ہاں آفتاب کی حدت اور تمازت تھی دوسرے کے یہاں ماہتاب کی ضیا پاشی تھی۔ ایک طوفانوں کی سطوت لیے اورنگ آباد میں جلوہ گر ہوا۔ اور اسلام کے دشمنوں پر طوفان بے درماں بن کر ٹوٹ پڑا۔ دوسرا تاروں کی خاموشی اور گلاب کی خوشبو لئے کاندھلہ میں ظہور پذیر ہوا اور اپنی خاموش عطر بیزی سے مشام جان تک کو معطر کر دیا۔

دونوں کی نصب العین کی وحدت دیکھئے اور پھر ان کے قائم کردہ تحریکوں کے باہمی اختلافات پر نظر ڈالئے۔ ایک طرف باطل پر ضرب لگانے اور دین دشمن طاقتوں کو [illegible] کرنے میں دونوں متفق رہتے ہیں۔ لیکن زندگی کے بعض گوشوں میں کتنا اختلاف

دو فرق ہے۔ کتنی غلط فہمیاں اور گمان ان میں ایک دوسرے کے خلاف رہ جاتے۔ گفتگو کرنے میں اس کا اندازہ لگانا کس قدر مشکل ہوتا۔

آئیے دونوں کی تحریروں کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ان کے اندر کتنا اتحاد تھا۔ دونوں کیا چاہتے تھے اور حالات دونوں کے درمیان کتنا بعد اور اختلافات پیدا کر چکے ہیں۔

فریضۂ شہادت حق

دونوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا مشن بنایا تھا۔ اقامت دین اور شہادت حق کے سچے جذبے دونوں کی ایک ہی روش و رفتار تھی۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے [illegible] آخری [illegible] دیا ہے۔ [illegible] شہادت حق کے [illegible] سے کہا تھا کہ

اللہ سے جب [illegible] کر چکے کا جو معاہدہ آپ نے کیا تھا اس کی یہ [illegible] ہرگز نہیں ہو سکتی کہ ایک گوشے میں جب چاہا بیٹھا اور جب چاہا [illegible] دیا۔ ادھر قدم بڑھانے سے پہلے اپنی واپسی کی کشتیاں [illegible] دیجئے [illegible] کہ اب پلٹ کر جانے کے لئے کوئی جگہ آپ کے لئے نہیں ہے۔ خدا سے [illegible] کے بعد جو جان [illegible] کو آپ [illegible] ہیں اب وہ [illegible] نہیں [illegible]۔ اس معاہدہ کے ساتھ ہی آپ سر [illegible] کی بازی لگا چکے۔ اب آپ کو جان لڑا کر کام کرنا ہے۔ خود اس راہ پر چلنا ہے اور دوسروں کو چلانا ہے [illegible] کوئی خرابی ہوتی نظر آئے تو [illegible] سے ساتھ اسے دور کرنے کی فکر کیجئے جس طرح آپ کے گھر میں آگ لگ جائے تو اسے بجھانے کی فکر کریں گے۔ آگے والے اگر نہ چلے تو پیچھے سے سرک نہ جائیے۔ بلکہ اسے یا تو چلنے پر مجبور کیجئے یا اسے [illegible] اور خود آگے بڑھئے۔ [illegible] کام میں [illegible] دلیل [illegible] یا وقت [illegible] اور دل و دماغ اور جسم [illegible] اس راہ میں صرف کرنے سے جی چرائیں گے یا دوسرے کاموں کو اس کام پر ترجیح دیں گے تو آپ خدا سے بے وفائی کریں گے۔

مولانا محمد الیاس نے بھی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ دین کے [illegible] کی وجہ سے اس کی [illegible] اور تجلیاں رخصت ہوتی جا رہی ہیں اور ارکان دین [illegible] کے اضمحلال کی وجہ سے نوافل و اطاعات کی رونق [illegible] اور شادابی رخصت ہو چکی ہے۔ اصل کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ہے جسے قرآن نے شہادت حق اور اقامت دین کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے [illegible]۔

میرے حضرات!

یہ وظیفہ و وظائف اور یہ [illegible] کی [illegible] میں [illegible] اور دین کی [illegible] کی ہر چیز در حقیقت ایمان کی [illegible] اور اس کے [illegible] [illegible] [illegible] نہ وظیفہ [illegible] اور نہ کسی کی [illegible] اور [illegible] حدیث شریف میں ہے کہ جس وقت دین کے [illegible] ترک [illegible] ہو گی [illegible] امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

سکتے ہیں اس وقت دعاؤں میں رو رہیں روکر گڑگڑانے والوں کی دعا مقبول نہیں ہونے کی۔ ابواب رحمت بند ہو چکے ہوں گے۔ ایسے رحمت کھلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ مسلم کا فروغ اسلام کے فروغ کی کوشش میں لگنے کے اور کے علاوہ ہرگز مقصود نہیں۔ حق ہو جانے مومن کے ساتھ رحمت کے ساتھ توجہ کرنے اور کرم و الطاف کے ساتھ برتاؤ کرنے کا ارادہ صرف اسی وقت فرما رکھا ہے کہ جب وہ اسلام کے فروغ میں اپنا سعی صرف کرتا ہو۔" (حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت ص۲۴۱)

پھر اس فریضے کو انجام دینے کے لئے حضرت مولانا۔۔۔ مرحوم نے جو جانکاہی کی اس کا ثبوت عالم اسلام۔۔۔ میں پھیلی ہوئی ان کی تحریک ہے۔ آخر وقت میں جبکہ ضعف ناتوانی اور عجز و درماندگی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اقامت دین کے لئے آپ کی کوششیں بھی تیز تر ہو گئیں انہیں مولانا منظور احمد نعمانی مدظلہ العالی نے صحیح لکھا ہے۔

"جسمانی لحاظ سے اگرچہ نہایت نحیف و ناتواں تھے مگر اسی مقدس مقصد کے لئے بھی انتھک اور اس قدر بے پناہ جدوجہد کرتے دکھاتے کہ میرا اندازہ ہے کہ اگر بالفرض کسی شخص کے سامنے جنت اپنی ساری نعمتوں اور دلفریبیوں کے ساتھ اور جہنم اپنی ساری ہولناکیوں سمیت منکشف کر دی جائے اور اس سے کہا جائے کہ یہ کام کرو گے تو یہ جنت ملے گی اور نہیں کرو گے تو اس جہنم میں ڈالے جاؤ گے۔ تو شاید اس کی سعی و جہد اس سے زیادہ نہ ہو سکے گی جو مولانا محمد الیاسؒ کی بالخصوص آخری زمانہ میں تھی۔"

(میری زندگی کے تجربے از مولانا محمد منظور نعمانی)

ایک طرف خدمت دین کے لئے یہ تڑپ اور بے قراری تھی اور دوسری طرف آپ کی انکساری اور تضرع زاری بھی ملاحظہ ہو ایک گرامی نامہ تحریر فرماتے ہیں۔

"جس مذہب کے لئے ہزاروں جانوں کا طیب خاطر سے پیش کردینا اس کی قیمت کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ اور جس مذہب کی اصلی قیمت سوزش جگر اور خون دیدہ بہانا تھی۔ اس کے لئے ہمارا یہ برائے نام قدموں کا اٹھانا اور اس قدر ضعیف اور کم مقدار اپنی محنتوں کا وابستہ رکھنا اصل فریضہ سے کچھ نسبت نہیں رکھتا۔ لیکن خدائے پاک کی ذرہ نوازی اور مراحم خسروانہ اور اس اخیر زمانہ والوں کے لئے ان کی مساعی پر صحابہ کے پچاس کے برابر اجر وثواب کے ملنے کی خوشخبریاں اور حق تعالیٰ کے وعدے اور لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا کی جیسی تبشیر ہماری اس مساعی کے بارے میں بڑی امیدیں دلاتی ہیں۔"

(مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت ص۲۳۱)

اسلام ــــ ایک مکمل نظام حیات

مولانا مودودیؒ کا دوسرا بڑا کارنامہ یہی ہے کہ آپ نے اسلام کو مکمل نظام حیات کی حیثیت سے پیش کیا جب کہ عوام تو کجا اکثر علماء اس سلسلہ میں غلط فہمی کا شکار تھے۔ انہوں نے تو اسلام کے نظام عبادات کو اپنانے کے ساتھ ہی کمیونزم کا لبادہ بھی اوڑھ رکھا تھا۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی بھی اشتراکیت سے متاثر تھے۔ انہوں نے اسلام کے ساتھ اشتراکیت کے معاشی نظام کی پیوندکاری کی کوشش بھی

کی تھی۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم جیسے زیرک شخص بھی ڈارون کے نظریۂ ارتقاء سے متاثر تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے تو لادینی جمہوریت کا نغمہ خواں اپنا شیوہ بنایا تھا۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے متقی اور خدا ترس عالم بھی وطنیت کے علمبردار تھے۔ علامہ شبلی اور محمد علی جوہر جیسے محقق اور بے باک لیڈروں کی تحریروں اور تقریروں سے بھی مغربی افکار و نظریات سے مرعوبیت صاف نمایاں تھی۔ یہ واحد مولانا مودودیؒ ہی تھے جنہوں نے باطل افکار و نظریات سے بغیر متاثر ہوئے اسلام کو مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس کے ایک ایک گوشے کی وضاحت کی اس پر پڑی ہوئی دبیز چادروں کو ہٹایا۔ اور اسلام کی مکمل تعلیمات نگاہوں کے سامنے رکھ دیں۔

مولانا محمد الیاسؒ نے بھی اسلام کو مکمل نظام حیات کی حیثیت سے اپنایا تھا۔ اور رسول اکرمؐ کی لائی ہوئی تعلیمات کی روشنی میں انسانیت کے سارے مسائل حل کرنا چاہتے تھے لیکن یہ طریقۂ کار اور لائحۂ عمل وہ نہ اپنایا جا سکا جس سے مقصود حاصل ہو سکتا تھا۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا الیاسؒ سے اپنی پہلی ملاقات ہی میں ان کمزوریوں اور لائحۂ عمل کی ان خامیوں کو بھانپ لیا تھا لیکن ترجمان القرآن کے صفحات میں ان کا تذکرہ کرنا مناسب نہ سمجھا کہ اس سے اختلافات پیدا ہوتے۔ پھر اس کا بھی امکان تھا کہ حق تعالیٰ اپنی خصوصی عنایت سے ان خدشات کو رفع فرما دیتے۔

مولانا محمد الیاسؒ کے سلسلے میں ہمارا یہ دعویٰ ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو نامانوس اور اجنبی معلوم ہو کیونکہ ان کی برپا کی ہوئی جماعت تبلیغ آج تحریک صلوٰۃ بن کر رہ گئی ہے۔ وہ لوگوں کو صرف نماز سکھاتی اور چلہ کشی کی دعوت دیتی ہے لیکن قارئین کو اس پر حیرت نہ ہونی چاہیئے ہم ذیل میں ملفوظات کے کچھ اقتباسات پیش کرنا چاہتے ہیں ان کی روشنی میں ہمیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گی کہ آپ کیا کام کیا چاہتے تھے۔

میری تحریک صلوٰۃ نہیں ہے

مولانا الیاسؒ کی زندگی کا خاص جوہر بلند ہمتی اور عالی حوصلگی تھا۔ دکھوں سے اپنی پوری زندگی کی عملی جدوجہد، تقاریر ارشادات اور مکاتیب کے ذریعہ زندگی کے ہر گوشے کی اصلاح کی کوشش کی تھی، ایک مرتبہ اپنے عزیز مولوی ظہیر الحسن صاحب ایم اے علیگ سے فرمایا جو ایک وسیع النظر عالم ہیں۔

"ظہیر الحسن!
میرا مدعا کوئی پاتا نہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ تحریک صلوٰۃ ہے۔ میں قسم سے کہتا ہوں کہ ہرگز تحریک صلوٰۃ نہیں ہے"

ایک روز بڑی حسرت سے فرمایا "میاں ظہیر الحسن ایک نئی قوم پیدا کرنا ہے۔"

ظاہر ہے کہ نئی قوم پیدا کرنے کے لئے ہمہ جہتی کوشش درکار ہوگی۔ زندگی کے ہر گوشے سے متعلق رہنمائی کرنی ہوگی ہر گوشۂ زندگی کے نقوش اجاگر کرنے ہوں گے۔ عبادت و ریاضت سیاست و معیشت، عدالت و سیادت اور زندگی کے بقیہ تمام گوشوں کے لئے اصول پیش کرنا ہوں گے۔ اور یہ سب اسلام کو مکمل نظام حیات کی حیثیت سے پیش کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ ایک صحبت میں آپ نے فرمایا۔

"ہماری اس تحریک کا اصل مقصد ہے مسلمانوں کو جمیع ما جاء به النبی سکھانا (یعنی اسلام کے مکمل نظام سے امت مسلمہ کو وابستہ کرنا) یہ تو ہے ہمارا مقصد، رہی قافلوں کی یہ چلت پھرت اور تبلیغی گشت سو یہ اس مقصد کے لئے ابتدائی ذریعہ ہے اور کلمہ و نماز کی تعلیم و تلقین گویا ہمارے پورے نصاب کی الف ب ت ہے۔"

یہ اقتباس مولانا منظور نعمانی کی مرتب کردہ "ملفوظات"

مولانا محمد الیاس ؒ کی قسط نمبر سے ماخوذ ہے جس کا بغور مطالعہ کرنے کے لئے خود مولانا نعمانی اس دعوت کے کارکنوں کو مشورہ دیا ہے۔ کیا وہ ان اقتباسات پر تھوڑی دیر ٹھہر کر غور فرمائیں گے؟

اس کتاب کے صفحہ کے اس اقتباس کو پڑھئے۔

"ہماری اس تحریک کا اصل مقصد امت میں بس دین کی طلب و قدر پیدا کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ نہ کہ صرف کلمہ اور نماز وغیرہ کی تصحیح و تلقین۔"

تحریک کی وسعت

مولانا الیاس ؒ نہ صرف یہ کہ اسلام کو مکمل نظام حیات کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ تمام الٰہی طاغوت کے سخت مخالف تھے۔ ان کی اپنی خواہش تھی کہ سیاست و معیشت اور عدالت و فوجداری کے مسائل بھی اسلام کی روشنی میں حل کئے جائیں۔ غیروں کی استعماریت اور غلبہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب کو ایک خط میں لکھا۔

"حافظ صاحب! مجھے بڑی غیرت آتی ہے کہ مسلمانوں کی حریت کی جانچ کرنے والے کفار ہوں۔"

مولانا ہی کو ایک ایسے ہی موقع پر میوات کے لئے تحریر فرماتے ہیں:

"زیادہ زور اس امر پر دیا جائے کہ قوم اپنی پنچایتیں اور سب اپنے کاروبار اور سب فیصلے شریعت کے موافق کرنے ہی کو اسلام کو سمجھے ورنہ اسلام نہایت ناقص ہے۔ بلکہ بسا اوقات احکام شرعیہ کی بے تعلقی اور بے رغبتی اور توہین کی بدولت اسلام جاتا رہتا ہے اور یقیناً کفر ہو جاتا ہے۔

"اس یہاں سے باہمی نکاح کا استخفاف معیوب سمجھنا اور اس سے عار آنا ہے جس کو پہلے تو سنا ہے کہ حرام اور کفر سمجھتے تھے اب زبان سے تو حلال اور جائز کہتے ہیں مگر معاملہ وہی ہے۔ چنانچہ موضع اٹاور تحصیل نوح کے ایک مرد و عورت نے باہمی رضا ہو کر اس خیال سے کہ اگر یہاں نکاح ہو گیا تو قوم سخت سزا دے گی ملک سے نکل کر نکاح کر لیا اور ضلع گوڑگانواں میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ مگر افسوس کہ ظالم قوم نے دولہا کو جس کا نکاح رمضان المبارک کے اخیر جمعہ کو ہوا تھا۔ عید کے تیسرے دن جمعہ کے روز قتل کر کے ہاتھ پیر توڑ کر مٹی کے تیل سے جلا کر راکھ کو کسی دریا میں بہا دیا۔ یہ مضمون بہت زور سے بیان کرنے کے قابل ہے کہ کفر و شرک کو، زنا کو اور کسی اکبر الکبائر کو ایسا معیوب اور قبیح نہ سمجھیں اور اللہ کے حلال کردہ کو اس قدر معیوب سمجھیں۔ آپ ضرور بیان فرما دیں کہ کس طرح ایمان ان کا باقی رہا اور کیا سبیل ان کے ایمان کے باقی رہنے کی ہو سکتی ہے۔"

(مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت ص ۲۱۱)

اپنے ایک دوست کو جو مسلمان اہل حرفہ و اہل صنعت کی دینی اصلاح و ترقی کے خواہش مند تھے، سمجھاتے ہوئے آپ نے صاف صاف تحریر فرمایا کہ ہم نظام اسلام کے ذریعہ صنعت و تجارت کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔

اس عاجز ناچیز کی نظر کے اندر وہ
تبلیغ جس کے لئے آپ کو بھی بلایا تھا اور
خود بھی کوشاں ہوں اس کا منشاء دنیا کے
معمولات میں صنعت و حرفت و زراعت
و تجارت کو شریعت کے ماتحت اور
شریعت کے ... مطابق کرنا ہے۔
تبلیغ کی ابتداء اور اساس عبادات
سے ہے اور عبادات کے کمال کے بغیر ہرگز
معاشرت اور معاملات تک اصلاحی امور کی
پابندی نہیں ہو پا سکتی۔

(حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت صفحہ ۲۴۷)

مزید اقتباسات کا نقل کرنا طول لاحاصل ہوگا حضرت مولانا مرحوم کی یہ تحریریں صاف بتاتی ہیں کہ مولانا کے سامنے ایک مکمل اسلامی نظام کا خاکہ تھا۔ مکمل تعلیمات خداوندی سے وہ عوام کو روشناس کرانا چاہتے تھے۔ ان کے سارے مسائل قرآن و سنت ہی کی روشنی میں حل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن طریق کار کا فرق تھا۔ حضرت کا خیال تھا کہ عبادات پر ہی توجہ صرف کی جائے۔ البتہ یہ جد و جہد کہ ان کو پہونچایا جائے۔ ان کے آداب و شرائط کا پورا پورا خیال رکھا جائے تو ایک اسلامی ریاست کا نظام خداوندی کے طور پر خود بخود وجود میں آ جاتی ہے جس میں تبدیلیاں نظر آنی جاتی ہیں۔ دل بدل جاتے ہیں اور ایک صاف ستھرا معاشرہ قائم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کہتے تھے کہ آنحضورؐ نے جہاں عبادات کے ذریعہ معاشرے کو پاکیزہ اور صالح بنانے کی کوشش کی وہیں خدائی نظام کے نفاذ کے لئے باطل طاقتوں سے جنگ بھی کی۔ معاندین کو سرنگوں کیا۔ کے لئے تلوار اور تیر و تفنگ بھی استعمال کیا۔ صاف عبادات کے ساتھ ساتھ کوشش کی کہ اس سرزمین پر مکمل نظام اسلام کا قیام عمل میں آ سکے۔

عبادات — مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں

یہ وہ موضوع ہے جس پر پچھلے دنوں کافی معرکہ آرائی ہو چکی ہے۔ تحریک اسلامی کے مخالفین نے اس موضوع کو خوب اچھالا۔ مولانا علی میاں نے اپنی کتاب عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح میں اس پر خوب بحث کی ہے اور مولانا مودودی پر الزام لگایا ہے کہ ان کے یہاں تو عبادات مقصد کے حصول کے ذرائع ہیں اور کچھ نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ موضوع اتنا اہم کیوں ہے۔ میں اس پر بحث کرنا نہیں چاہتا کہ یہ نقطہ نظر کیا ہے کیوں کر صحیح ہے۔ پچھلے صفحات میں اس پر کافی بحث ہو چکی ہیں۔ یہاں ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ خود حضرت مولانا محمد الیاسؒ بھی اس نظریہ کے قائل تھے۔ وہ خود اس نقطہ نظر کے علمبردار تھے جس نے عبادات کو مقصود بنا کر امت مسلمہ کو جمود و تعطل میں دھکیل دیا تھا۔ وہ در در جا کر اس پر تنقید بھی کرتے رہتے تھے۔ ایک بار آپ نے فرمایا:

آج کل دین کے بارے میں یہ غلط فہمی نہایت عام ہو گئی ہے کہ عبادات کو ذرائع کو مقاصد کو درجہ دے دیا جاتا ہے۔ اور اگر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ دین کے تمام شعبوں میں یہ غلطی گھس گئی ہے اور ہزاروں خرابیوں کی یہ جڑ ہے۔

(ملفوظات مولانا محمد الیاسؒ از مولانا منظور نعمانی صفحہ)

ایک مرتبہ تصوف و طریقت پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا

طریقت کو یہ خاص غایت ہے اللہ تعالیٰ کے احکام و اوامر کا خوب طبعی اور بوقتی کا کروہ طبعی ہو جانا ہے تو بس طریقت کی غایت بالی جو کچھ ہے سو وہ اس کی تکمیل کے ذرائع ہیں

(ملفوظات مولانا محمد الیاسؒ صفحہ)

ایک بار فرائض پر زور دیتے ہوئے فرمایا:۔

"فرائض کا مقام نوافل سے بہت بلند ہے پھر سمجھنا چاہیے کہ جو نوافل سے مقصود ہی فرائض کی تکمیل اور ان کی کوتاہیوں کی تلافی ہوتی ہے، غرض فرائض اصل ہیں اور نوافل ان کے تابع اور فروع مگر بعض لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ فرائض سے تو غفلت برتتے ہیں اور نوافل میں مشغول رہنے کا اس سے بدرجہا زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔ مثلاً آپ حضرات جانتے ہیں کہ ... امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، یہ تمام شعبے اہم فرائض میں سے ہیں مگر کچھ ہی جو ان فرائض کو ادا کرتے ہیں۔ لیکن دوسرا نوافل میں اشتغال و انہماک رکھنے والوں کی اتنی کمی نہیں ہے۔"

(ملفوظات مولانا محمد الیاس ص ...)

مولانا محمد الیاس کی ان تحریروں کے ہوتے مولانا مودودی ہی کی مخالفت پر کمر بستہ رہنا کہاں تک قرین عقل وانصاف ہے۔ تعجب ہوتا ہے اور افسوس ہوتا ہے ... ان حضرات پر ... آتی ہے

ذکر کا صحیح مفہوم

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر، عبادات اور تقویٰ کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ:

"ذکر الٰہی کا مطلب محض یہ نہیں ہے کہ صرف زبان پر اللہ اللہ جاری ہو۔ بلکہ ذکر الٰہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا سے غافل کرنے والی ہیں ان میں پھنسو اور پھر خدا سے غافل نہ ہو۔ دنیا کی زندگی میں جہاں قانون الٰہی کو توڑنے کے بے شمار مواقع آتے ہیں بڑے فائدوں کا لالچ اور بڑے بڑے نقصانوں کا خوف لئے ہوئے سامنے آتے ہیں وہاں خدا کو یاد کرو اور اس کے قانون کی پیروی پر قائم رہو۔

...... یہی وہ ذکر ہے جس کی ترغیب قرآن میں ان الفاظ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ	پھر جب نماز ختم ہو جائے تو زمین
فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَ	میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل
ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَ	(رزق) تلاش کرو اور اللہ
اذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ	کا ذکر کرو تاکہ تم فلاح پا
تُفْلِحُوْنَ ۔	سکو

(اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر ص ...)

مولانا محمد الیاس کے نزدیک بھی "ذکر اللہ" کی تعریف یہی ہے۔ فرماتے ہیں:

"حقیقی ذکر اللہ یہ ہے کہ آدمی جس موقع پر اور جس حال اور جس مشغلہ میں ہو اس کے متعلق اللہ کے جو احکام و اوامر ہوں ان کی نگہداشت رکھے اور میں اپنے دوستوں کو اسی ذکر کی زیادہ تاکید کرتا ہوں۔"

(ملفوظات مولانا محمد الیاس ص ۲۵)

دین کی ترتیب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"دین کیا ہے کہ ہر موقع پر اللہ کے اوامر کو تلاش کرتے ہوئے اور ان کا دھیان کرتے ہوئے اور اپنے نفس کے تقاضے کی تاثیر سے بچتے ہوئے ان کی تعمیل ہو سکے دنیا اور اللہ کے حکموں کی تلاش اور دھیان کے بغیر کام ہی کیا جا رہا ہے۔"

مولانا علی میاں ندوی اپنی کتاب "حضرت مولانا

محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت میں ذکر کے سلسلہ میں مولانا الیاس کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"ذکر کے متعلق مولانا کا فرمانا یہ تھا کہ حقیقت تو مرام ہے لیکن ذکر، ذکر لسانی اور ذکر قلبی میں محدود نہیں، زندگی کے مختلف احوال اور اعمال و اشغال کے بارے میں جو احکام وارد ہوئے ہیں دھیان کرتے ہوئے ان کے مطابق ان اعمال و اشغال کو انجام دینا ذکر ہے اس طرح پوری معاشرت اور پوری زندگی ذکر میں تبدیل ہو سکتی ہے۔" (صفحہ ۱۴۲)

حضرت مولانا اتحاد اسلامی کے علمبردار تھے

مولانا مودودیؒ نے تو آغاز کار ہی سے اتحاد اسلامی کی مہم شروع کر رکھی تھی۔ وہ مسلمانوں کو اسلام کی بنیاد پر ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنا چاہتے تھے۔ وہی وطنی بنیاد پر دینی وحدت کو پارہ پارہ ہو چکے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام کا رشتہ ہی وہ واحد رشتہ ہے جس کی بنیاد پر دنیا بھر کے مسلمان ایک لڑی میں پروئے جا سکتے ہیں۔ تبلیغ کے سلسلے میں بھی مولانا کا موقف یہی تھا وہ اسے عرب قومیت کی بنیاد پر نہیں۔ بلکہ اسلامی وحدت کی بنیاد پر اور اسے سارے مسلمانوں کا مسئلہ قرار دے کر حل کرنا چاہتے تھے۔ پھر ان کے نزدیک یہ اتحاد چند فروعی و جزوی مسائل کے لئے درکار نہ تھا۔ بلکہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے باطل طاقتوں کی مکمل سرکوبی کے لئے درکار تھا۔ حضرت مولانا محمد الیاس نے فرمایا

"ایک اس تحریک کے ذریعہ ہم ہر طبقہ کے علماء و اہل دین اور دنیا داروں میں میل ملاپ اور صلح و آشتی بھی کرانا چاہتے تھے۔ نیز خود علماء اور اہل دین کے مختلف حلقوں میں الفت و محبت اور تعاون و یگانگت کا پیدا کرنا بھی اس سلسلہ میں ہمارے پیش نظر بلکہ ہمارا اہم مقصد ہے۔ اور یہ دینی دعوت ہی انشاء اللہ اس کا ذریعہ و وسیلہ بنے گی۔ افراد اور جماعتوں میں اختلافات اغراض ہی کے اختلافات سے تو پیدا ہوتے اور ترقی کرتے ہیں۔ ہم مسلمانوں کو تمام گروہوں کو دین کے کام میں لگا کر اور خدمت دین کو ان کا سب سے اعلیٰ مقصود بنا کر کی اس طرح کوشش کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے جذبات اور طریق عمل میں موافقت پیدا ہو جائے۔ صرف یہی چیز نفرتوں کو محبتوں سے بدل سکتی ہے۔"

(ملفوظات مولانا الیاس صفحہ ۱۰۸)

ایک مرتبہ اپنی جدوجہد کا مقصد بتاتے ہوئے فرمایا کہ

"ہماری اس تحریک کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے سارے جذبات پر دین کے جذبہ کو غالب کر کے اور اس راستے سے مقصد کی وحدت پیدا کر کے اور حدیث "کرام مسلم" کے اصول کو رواج دیکر پوری قوم کو اس حدیث کا مصداق بنایا جائے۔

المسلمون کجسد واحد

(ملفوظات مولانا محمد الیاس صفحہ ۱۴۹)

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر اتحاد اور اخوت کی روح پیدا کرنا از بس ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے

(دوسرے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

اللھم الف بین قلوبھم واصلح
ذات بینھم وانصرھم علی اعدائھم
اے اللہ مومنوں کے دلوں میں محبت پیدا کر، ان کے باہمی تعلقات کی اصلاح فرما اور ان کے دشمنوں کے مقابلے میں ان کی مدد کر۔

نبیؐ کا ارشاد گرامی ہے۔
الا اخبرکم بافضل من درجۃ الصیام والصدقۃ والصلوٰۃ؟ اصلاح ذات البین وفساد ذات البین ھی الحالقۃ۔

میں تمہیں بتاؤں کہ روزے اور خیرات اور نماز سے بھی افضل کیا ہے؟ وہ ہے تعلقات کو ٹھیک کرنا۔ دو لوگوں کے باہمی تعلقات میں فساد ڈالنا وہ فعل ہے جو تمام نیکیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔

اسلام کی اسی تعلیم کے پیش نظر جماعت اسلامی ہند کی پالیسی اور پروگرام میں یہ شق درج ہے۔

"پالیسی اور پروگرام پر عمل درآمد کے لئے ضروری ہے کہ ہم مسلم وغیر مسلم حلیہ باشندگان ملک اور افراد وجماعتوں سے وسیع پیمانہ پر روابط قائم کریں۔ ان سے جڑے، باہم نکات اتفاق تلاش کریں اور سب کا تعاون حاصل کرنے اور سب کا تعاون حاصل کرنے کی فکر کریں۔ اور جو جس حد تک ساتھ دے سکے اس کو ساتھ لے چلنے کی کوشش کریں۔"

"مسلمانوں میں اسلامی کردار پیدا ہو، باہمی تعلقات درست ہوں ان میں اسلامی اخوت کا رشتہ مضبوط ہو۔ ان کے مختلف مکاتب فکر اور جماعتیں ایک دوسرے کے قریب آئیں اور وہ دینی بنیاد پر متحد و منظم ہو سکیں۔

ان سب کاموں کے لئے مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر اور جماعتوں سے تعاون کرنا، ان کا تعاون حاصل کرنا، انھیں منظم و متحد ہونے اور دستور ہند میں دیئے ہوئے بنیادی حقوق سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی طرف متوجہ کرنا اور ان کاموں کے لئے ملک کی فضا ہموار کرنا اور غیر مسلموں کا زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کرنا۔"

(جماعت اسلامی ہند پالیسی اور میقاتی پروگرام
(مارچ [illegible] تا اکتوبر [illegible]))

مندرجہ بالا اسلامی تعلیم کی تعمیل میں جماعت اسلامی ہند نے اتحاد و تعاون کی متعدد بار کوشش بھی کیں لیکن ان کا انجام کیا، امیر جماعت اسلامی ہند مولانا محمد یوسف مدظلہ العالی کی زبانی سنئے۔

میں نے ہدایت ربانی تعاونوا علی البر والتقویٰ کی تعمیل میں ایک خط مورخہ ۲ ستمبر [illegible] شیخ الحدیث مولانا ذکریا صاحب کو لکھا جس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ موصوف تبلیغی جماعت کے لوگوں کو اس طرف متوجہ فرمائیں کہ جماعت اسلامی ہند کی اصلاحی سرگرمیوں میں تعاون واشتراک کریں جس طرح کہ بعض مقامات پر جماعت اسلامی تبلیغی جماعت اسلامی کے ساتھ تعاون و اشتراک کیا کرتی ہے۔ میرا خط ۶ رمضان کو گیا تھا اور شیخ الحدیث صاحب نے ۷ شوال [illegible] کو جواب بھیجا لیکن اس میں دینی کاموں میں تعاون و اشتراک کے سلسلہ میں کوئی بات تحریر نہیں فرمائی۔

پھر میں نے ۲ دسمبر [illegible] کو ایک دستی خط شیخ کو بھیجا جس میں نے بتلایا کہ تبلیغی جماعت کی دینی سرگرمیوں کو اگرچہ وہ محدود ہیں، ہم مستقل اچھی نظر سے دیکھتے رہے ہیں اور ہم ان سے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ تعاون کریں

اور دعا کریں کہ خدا کے راستے میں ایک دوسرے کی رفاقت اور تعاون سے محروم نہ رہیں۔

میرے اس خط کا جواب مولانا زکریا صاحب نے ۸ ذی قعدہ یعنی ۲۰ دسمبر [illegible] ہی کو دیا۔ لیکن تعاون علی البر والتقوی کے سلسلہ میں شیخ کی طرف سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

اس کے بعد جون ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی لاگو ہو گئی اور جماعت اسلامی ہند کے بہت سے ارکان جیلوں میں ڈال دیئے گئے۔ جیل ہی میں رسالہ "برہان" دہلی جنوری ۱۹۷۶ء کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ شیخ الحدیث نے ایک کتابچہ (جو مولانا زکریا صاحب کا ایک پرانا غیر مطبوعہ مکتوب مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے ایک سابق استاد کے نام تھا اور [illegible] میں لکھا گیا تھا۔) "فتنۂ مودودیت" کے نام سے شائع کرا دیا جس کے بارے میں برہان کے ایڈیٹر نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "آج جب کہ جماعت اسلامی ممنوع ہے اس مکتوب کو شائع کرنا اور وہ بھی اشتعال انگیز عنوان سے بزدلی اور سخت قسم کی اخلاقی کمزوری ہے۔ پھر تبلیغی جماعت کا اس سے دلچسپی لینا بھی اس کے مسلک اور وقار کے خلاف ہے"

مجھے اس خبر کو پڑھ کر نہایت تعجب، رنج، ملال اور افسوس ہوا۔ میں تو شیخ صاحب سے برابر تعاون و اشتراک کی اپیل کرتا رہا اور شیخ کی طرف سے ہمیں "فتنۂ مودودیت" کی شکل میں جواب ملا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

(یالیت قومی یعلمون۔ از امیر جماعت اسلامی ہند شمارہ [illegible])

ایمرجنسی ختم ہو گئی لیکن اس کتاب کے اشتعال انگیز عنوان اور اس کے مباحث سے جو ضرر تبلیغی جماعت کے لوگوں کے دلوں میں پیدا کیا تھا وہ لمحہ کی طرح اس وقت بھی جبکہ مسٹر بھٹو کی پھانسی کے بعد بعض ان لوگوں نے سیدھے سادے مسلمانوں کو بہکایا جو اسلام دشمن ہیں اور تبلیغی جماعت کے مقامی افراد اور ذمہ دار بھی جماعت اسلامی کے خلاف ہنگاموں میں آگے آگے رہے۔

ہمارا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ یہ حضرات کس بات سے آخر ایسے اس اسلام دشمن سازش کا شکار ہو گئے۔

اوپر کے مضامین پر ایک نظر اور دوڑا لیجئے دیکھئے مولانا مودودی اور مولانا الیاس کے افکار میں کتنی وحدت یا اتفاق ہے۔ دونوں نظام اسلام کے نفاذ کے لئے بے چین و مضطرب، انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے بے قرار، سراپا جہد و سعی نظر آتے ہیں۔ مقصد سے لے کر اخلاق، فلاح آخرت کے لئے بے چینی دونوں میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ اتحاد و تعاون کے لئے دونوں جدوجہد کرتے رہے۔ پھر کیا آج ان تحریکات کے علمبرداروں کے لئے یہ موزوں و مناسب ہے کہ وہ ایک دوسرے سے نفرت کریں؟ کیا ان کے درمیان افتراق و انتشار کی یہ خلیج ختم نہیں کی جا سکتی۔

آج جب کہ دونوں اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے ہیں ہمیں اختلافات کو اور وسیع کر کے ان کی روح کو ایذا دینے کی غلطی نہیں کرنی چاہئے۔ کیا جماعت تبلیغ کے ذمہ دار حضرات اور اس سے متعلق نوجوان دوست ہماری اس آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار ہیں۔

فبشر عباد الذین یستمعون القول
فیتبعون احسنہ اولئک الذین
ھداھم اللہ و اولئک ھم
اولوا الالباب۔

حق کا ترجمان ہے تو

پنجاب یونیورسٹی فیصل آڈیٹوریم میں تعزیتی جلسے کی تفصیلی روداد

۲۷ ستمبر کو فیصل آڈیٹوریم سوگواروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سب مولانا مودودی کو نمناک آنکھوں سے خراج عقیدت پیش کرنے آئے تھے۔ اس تقریب میں عالمِ اسلام کے ممتاز دانشوروں نے پرسوز تقریریں کیں جنھیں افادہ عام کی خاطر ٹیپ کر لیا گیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیں

ملک اختر جاوید صدر جمعیۃ الطلبہ

آپ نے فرمایا کہ سیدی مرشدی سید ابوالاعلیٰ مودودی تو دنیا سے تشریف لے گئے لیکن اپنی فکر کو چھوڑ گئے۔ انہوں نے پوری عمر میں حق کی دعوت دی اور اس دعوت کو ہم نوجوانوں تک پہنچایا۔ اور ہمارے ذہنوں کو اسلام کی طرف مائل کیا۔ آج میں ان کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں ان کے ماننے والے نہ صرف ہندو پاک میں ہیں بلکہ دنیا کے گوشے گوشے میں آپ کی دعوت پر لبیک کہنے والے موجود ہیں۔ یہ کلمات ادا کرتے ہی پورا ہال سیدی مرشدی مودودی مودودی کے نعروں سے گونج اٹھا۔

ڈاکٹر طٰہٰ الجابر

حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا۔ بھائیو اور بہنو! میرے پاس وقت نہیں ہے کہ میں تقریر کروں یا آپ سے کچھ کہوں۔ مولانا صرف پاکستان ہی کے نہیں تھے بلکہ پوری دنیا کے لیے تھے اور آپ اسلام کے ان ان رہنماؤں میں سے ہیں جنھوں نے حضورؐ کے مشن کو تازہ کیا۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔ حسن البناء شہیدؒ، امام سید قطبؒ، علامہ خمینی اور مولانا مودودیؒ۔ انھوں نے اسلام کو تازہ کیا۔ حضورؐ جب دنیا سے رخصت ہوئے تو اس وقت بھی مسلمان ایک آزمائش سے دوچار تھے لیکن حضورؐ نے جو راستہ بتایا تھا اسی راستہ کو صحابہ کرامؓ نے اختیار کیا اور اس کو اپنا اسوہ بنایا اور پوری دنیا میں اس کا بول بالا کیا۔ اسی طرح سے مولاناؒ آج دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں تو ان کے ماننے والوں پر یہ لازم ہے کہ وہ اس طریقہ کار کو اختیار کریں جس کی مولانا نے نشاندہی کی تاکہ امت کو کوئی ایسا نقصان نہ ہو پہنچے جو دعوت سے منحرف کرنے والا ہو۔

آخر میں میں اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں اس بات کی توفیق دے کہ ہم اس کلمہ کو بلند و برتر کریں۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو اس وقت مولانا کی روح کو سکون نصیب ہوگا اور نہ صرف ان کو بلکہ دنیائے مسلم کو

کو نصیب ہوگی۔

عبداللہ عقیل

حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا میرے بھائیو اور بہنو، چاہے ہم کتنی ہی تعریفیں کریں یا لکھنے والے لکھیں لیکن آپ کے کام اور دعوت کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ آپ کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ آپ بڑے قاعدے کے ساتھ اپنے رب سے جا ملے۔ ہمیں ان کا تعارف شروع میں ان کتابوں سے حاصل ہوا جن کا ترجمہ عربی میں جناب مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے کیا۔

مولانا کے افکار نے ہند و پاک میں ایک زبردست فکری انقلاب پیدا کیا جس طرح حسن البنا شہید نے عرب میں ایک فکری انقلاب برپا کیا اور مولانا نے اسلام کو ایک جامع نظام کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس طرح سے نہیں کہ اسلام مسجدوں اور مدرسوں میں محدود ہے بلکہ دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ مولانا اور حسن البنا شہید اس اعتبار سے ایک ہی منزل کے راہی تھے۔ اور دونوں نے ان تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کر دیا جو اسلام کے دشمنوں نے اسلام کے خلاف پھیلایا تھا۔ یہودی اور اسلام دشمن عناصر یہ چاہتے تھے کہ اسلام کو صرف مسجدوں میں محصور کر دیا جائے۔ لیکن ان کے مقابلہ میں اخوان اور مولانا مودودی کی تحریک مقابلے میں آئیں۔ اور ان دونوں نے اسلام کی صحیح صورت پیش کیں۔ حسن البنا اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے لیکن ان کی دعوت اور ان کا فکر اب بھی موجود ہے اسی طرح مولانا مودودی بھی دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن ان کی دعوت باقی ہے اور انشاء اللہ باقی رہے گی۔

حضور جب اس دنیا سے تشریف لے گئے تو صحابۂ کرام پر ان کی وفات کا بہت زیادہ اثر تھا بلکہ کچھ لوگ یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ آپ دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں اور معاملہ بالکل نازک موڑ پر پہنچ گیا تھا۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی نے صحابہ کو اس آیت کے ذریعہ سمجھایا: من کان یعبد محمداً فان محمداً قد مات۔ ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت۔

اب آخر میں میں پاکستانی مسلمانوں بالخصوص جماعت اسلامی اور نوجوانوں سے یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ اسلام کے پیغام کو اس دنیا میں پھیلائیں اور اس پر عمل کریں جس طرح مولانا مودودی اور ان کے رفقاء نے بتایا ہے۔ اور اسلام کی راہ میں جہاد کریں اور دعوت کو عام کریں۔ یہ آواز صرف اخوان المسلمین، جماعت اسلامی کی نہیں ہے اور نہ یہ کوئی نئی دعوت ہے بلکہ یہ وہی تحریک ہے جو حضرت محمد نے پیش کی تھی۔ اس بنا پر پاکستانی مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ وہ اس دعوت کو کامیاب بنائیں اور یہ جان لیں کہ انشاءاللہ یہ دعوت کامیاب ہو کر رہے گی۔

اس کے بعد **ارشد فارانی** نے مولانا مرحوم کی شان میں خراج عقیدت پیش کیا۔

۱۔ علم کی زباں ہے تو۔ حق کا ترجماں ہے تو۔ صدق کا نشاں ہے تو۔ عشق کی اذاں ہے تو

سیل بیکراں ہے تو میر کارواں ہے تو۔ میر کارواں ہے تو

۲۔ شمع انجمن ہے تو۔ شاخ نسترن ہے تو۔ زینت چمن ہے تو۔ غلغلۂ وطن ہے تو

حسن گلستاں ہے تو۔ میر کارواں ہے تو۔ میر کارواں ہے تو

۳۔ سیل جوئبار تو اوج کوہسار تو صاحب وقار تو مرد حق شعار تو

تیغ بے اماں ہے تو میر کارواں ہے تو میر کارواں ہے تو

۴۔ جہل کا رقیب تو عالم و ادیب تو عشق کا نقیب تو رشک عندلیب تو

گل کا رازداں ہے تو۔ میر کارواں ہے تو میر کارواں ہے تو

۵۔ تیغ ہے ترا قلم زہے ترا علم تو ہے داعی حرم تجھ سے دین کا بھرم

حق کا پاسباں ہے تو میر کارواں ہے تو میر کارواں ہے تو

۶۔ تماریوں کا پیشوا قافلے کا رہنما مخلصوں کا ہمنوا تیرگی میں اک دیا

مرشدِ زماں ہے تو میر کارواں ہے تو میر کارواں ہے تو

۷۔ بزم وقت گفتگو رزم وقت جستجو دھوم تیری چار سو تو وطن کی آبرو

دولتِ گراں ہے تو میر کارواں ہے تو میر کارواں ہے تو

۸۔ میرے رہبر و امام کامیاب و شاد کام نیک بخت و نیک نام تجھ کو ہو میرا سلام

زیبِ داستاں ہے تو میر کارواں ہے تو میر کارواں ہے تو

مولانا عباس علی خاں صاحب امیر جماعت اسلامی بنگلہ دیش۔

حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا۔ حضرات! میں اس وقت اس قابل نہیں ہوں کہ کچھ بول سکوں۔ مجھے مولانا رحؒ کی وفات سے اتنا صدمہ پہنچا ہے کہ والدین کی وفات سے مجھے نہیں پہنچا تھا۔ مولانا پوری دنیا کے آدمی تھے صرف ہند و پاک اور بنگلہ دیش کے لیے نہیں اور مجھے جو کچھ ملا مولانا مرحوم ہی کی بدولت ملا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم عطا کرے اور ہم میں سے جو بھی تحریک اسلامی سے وابستہ ہیں، ان پر یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اس تحریک کو لیکر آگے بڑھیں تاکہ ان ممالک میں اسلامی نظام قائم کر سکیں۔ اگر یہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوگا اور مولانا کی روح کو بھی سکون نصیب ہوگا۔ میری یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں جلد از جلد اسلامی نظام قائم کر دے۔ آمین۔

لیاقت بلوچ

حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا۔ محترم امیر جماعت اسلامی پاکستان اور کنٹ کے اس غم میں ڈوبے ہوئے نوجوانو اور ساتھیو! آج ایک ایسی تعزیتی تقریب ہے جس میں ہم نہ چاہتے ہوئے شریک ہیں ہم میں سے کوئی یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس اجلاس میں یہ سنے کہ آپ فوت ہو گئے۔ اگر یہ ہوتا کہ کسی کی موت کو ٹالا جا سکتا ہے تو ہم مولانا کی زندگی بچانے کے لئے سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار تھے آج جہاں اپنے قائد کی موت کا غم ہے وہیں ہمیں افسوس ہے کہ آج اس سرزمین کے ایک چپہ پر بھی اس کی مرضی کے مطابق اسلامی نظام قائم نہیں کر سکے۔ لیکن آج ہم اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ ایک دن ایک نیا سورج طلوع کر کے رہیں گے اور اس سرزمین کے چپہ چپہ پر اسلامی نظام قائم کر کے رہیں گے۔ جہاں آج ہمیں ان کی وفات کا غم ہے وہیں اس بات پر خوشی بھی ہے کہ ان کے ماننے والے دنیا کے گوشے گوشے میں موجود ہیں اور دنیا کے گوشے گوشے سے لوگ تعزیت کے لئے آرہے ہیں۔ اب میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں ہر غزوہ اور گھمنڈ سے پاک کر کے اس کے بنائے ہوئے اصولوں پر چلنے والا بنائے۔

اخوان کے ممتاز لیڈر......

ڈاکٹر کمال سنانیری

حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا۔ بیٹو اور بیٹیو! میں یہ کیسے کہوں کہ یہ غم ہم پر ٹوٹ پڑا۔ یہ اللہ کا حکم ہے اس کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اس دور میں مردانِ حق کی بہت کمی ہے لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ میرا بھائی، میرا استاذ خوش و خرم اللہ تعالیٰ کے جوار میں رخصت ہو گیا۔ جو کچھ ان کے ذمہ تھا انہوں نے کیا اور پہنچایا۔ مولانا ہمیں چھوڑ کر اس طرح رخصت ہو گئے۔ جس طرح حضورؐ نے صحابہ کرام کو چھوڑا تھا۔ ہر صدی میں اللہ تعالیٰ ایک رہنما پیدا کرتا ہے اور آپ بھی انہیں میں سے ہیں اخوان چاہے کہیں بھی ہوں سب آپ کی وفات پر دکھ اور کرب محسوس کرتے ہیں۔ اب آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ جو لوگ رخصت ہو گئے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نبیوں، صدیقوں اور شہداء کے ساتھ اٹھائے اور ہمیں فتنوں سے محفوظ رکھے اور بھٹکنے سے بچائے اور استاذ عبدالقادر عودہؒ اور حسن البناء شہیدؒ اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ جو راستہ چھوڑ گئے ہیں ان پر

چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سعید حوّا

مولانا کی زندگی امت

اسلامی کی تاریخ میں ایک نمایاں نشان ہے اور پاکستان میں بھی۔ اس کے بعد آپ نے حضورؐ کے اس قول کو دہرایا جس میں آپ نے فرمایا۔ "تیس سال تک خلافت چلے گی پھر بادشاہت میں تبدیل ہو جائے گی۔ اور اس دور میں ملت پستی میں چلی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ امت کو اس پستی سے اٹھانے کے لئے اپنے محبوب بندوں کو اٹھاتے گا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس دور کی پستی کو دور کرنے کے لئے ایک حسن البنا شہید کو اٹھایا اور دوسرے سید ابوالاعلیٰ مودودی کو یہ وہ دور تھا جب کہ دنیا کے اسلام کے اندر متضاد چیزیں پھیل چکی تھیں۔ بہت خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں ایسی صورت میں جبکہ امت ذلت کا شکار ہو چکی تھی ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو اسلام کی تجدید کر سکے اسلام کو اچھی طرح جانتا ہو اور اسلام کی تاریخ کو جانتا ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ اسلامی تعلیم لوگوں کے سامنے کس ڈھنگ سے پیش کیا جائے اور اس کشمکش کے اندر کیسے اسلامی تعلیم دی جائے اور لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک حسن البنا شہید کو پیدا کیا اور دوسرے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ہوئے حسن البنا شہید نے اسلامی تحریک کو ایک صحیح خطوط پر چلایا۔ ابھی یہ تحریک جاری ہی تھی کہ ہم ان سے محروم ہو گئے اور ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا لیکن جب مولانا کی کتابیں ہم تک پہنچیں تو وہ کمی پوری ہوتی دکھائی دی۔ لیکن اس سانحہ کے بعد اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب یہ کمی کس طرح پوری کر رہے۔

اس موقع پر ہم بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ دنیا کے اندر آپ ہی نے پاکستان کا ایک مقام پیدا کیا اور آپ ہی نے اس کو دنیا کے اندر متعارف کرایا اور آپ ہی نے پاکستان کی خوشبو کو باہر پھیلایا اگر مولانا اس خوشبو کو نہ پھیلاتے تو لوگ نہ جانتے کہ پاکستان کیا ہے اور کہاں ہے۔ مولاناؒ نے پاکستان کا سیاسی مقام پیدا کیا۔ آپ ہی نے اس ملک اور اس کے مسائل سے دنیا کو روشناس کرایا۔ اگر آپ نے متعارف نہ کرایا ہوتا تو چاہے جتنے بھی مسائل ہوں کوئی ان کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ اور آپ کی جو بھی کوششیں ہیں پاکستانی حکومت کی کوششیں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔

یوسف القرضاوی

آپ ذرا پچھلی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ امت پستی کا شکار تھی اور اسلام کی ساکھ کو پوری طرح اکھاڑنے اور ختم کرنے کی کوششیں اپنے شباب پر تھیں تو آپ کو معلوم ہے کہ پانچویں صدی میں امام غزالی اور چھٹی صدی میں امام تیمیہ کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا تاکہ اس دور کے لوگوں سے مقابلہ کر سکیں اور اسلام کا صحیح تصور لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں۔ اور آخر میں جس دور کو میں بیان کر رہا ہوں اور جس میں اسلام کی ساکھ اکھڑ چکی تھی۔ وادی نیل میں ایک بیس سال کا نوجوان حسن البنا شہید اٹھتا ہے اور تقریباً اسی عمر میں دوسرا نوجوان سید ابوالاعلیٰ مودودی اٹھتا ہے۔ اور الجہاد فی الاسلام جیسی گراں قدر کتاب تصنیف کرتا ہے۔ امام حسن البنا شہید کے متعلق تو مجھے کچھ کہنے کا موقع نہیں ہے لیکن مولانا کے بارے میں مجھے کچھ کہنا ہے۔ مولانا اس وقت اٹھے جبکہ دنیا کو آپ کی ضرورت تھی۔ انہوں نے مغربی فکر کو خوب سمجھا جبکہ لوگ اسی کے سامنے سر جھکاتے جا رہے تھے جب کہ اس بات کی ضرورت تھی کہ کوئی ان کا انہیں کی زبان میں اسی زمانے میں مقابلہ کر سکے۔ اور اپنی فکر پیش کرے جو دین کا صحیح تصور پیش کرنے والی ہو۔

مولانا اسی زمانہ میں اسلامی مفکر کی حیثیت سے نمودار۔

ہوئے اور اسلام کو ایک جامع نظام کی حیثیت سے پیش کیا۔ جبکہ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام کو مختلف شکل سے پیش کیا جا رہا تھا۔ اسلام دشمن یہ چاہتے تھے کہ مغربی تہذیب کو اسلام بنایا جائے یعنی سود کو حلال کیا جائے نکاح کو اپنے ڈھنگ پر پیش کیا جائے۔ پہلے اسلام کو مجرم بنایا جائے پھر اس کے حل کو مغربی تہذیب کے ذریعہ پیش کیا جائے۔ اس زمانہ میں مولانا نے ان کے چیلنج کا مقابلہ کیا اور اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے پیش کیا جو خالص اسلامی تھا۔ اور مولانا رح نے اسلام کو اسلام کی طرح پیش کیا۔ اور ان سارے تمثیل کو رد کر دیا جو مختلف ناموں سے جانے جاتے تھے۔ مولانا رح کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ آپ صرف علمی حیثیت سے گفتگو کرنے والے نہیں تھے بلکہ وہ اسلام کو فکری حیثیت سے پیش کرنا چاہتے تھے۔ اور اس فکر کو عملی زندگی میں قائم کرنا چاہتے تھے۔ مولانا اپنے رب کے پاس خوش و خرم پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔ اس کے بعد اس حدیث کا حوالہ دیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضورؐ کے سامنے سے ایک جنازہ گذرا صحابہ نے کہا بہت اچھا آدمی تھا۔ اس پر آپ نے فرمایا وہ جنتی ہے۔ پھر دوسرا جنازہ گذرا۔ اس کے متعلق صحابہؓ نے فرمایا وہ بہت برا آدمی تھا۔ اس پر آپ نے فرمایا وہ جہنمی ہے اور ساتھ ہی آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جس کو انسان اچھا کہیں وہ اچھا ہے اور جس کو برا کہیں وہ برا ہے۔ چنانچہ آپ کی آنکھوں نے دیکھ لیا کہ لاکھوں انسانوں کی آنکھیں اشکبار تھیں اور مولانا کو اچھے ناموں سے یاد کر رہے تھے۔

اس موقعہ پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر پاکستان میں اسلامی نظام نہیں ہے تو پھر ایسے پاکستان کی کوئی ضرورت نہیں ہے چاہے پھر رہے یا ہندوستان کا ایک جزء بن جائے۔ کل مولانا کے جنازے نے یہ بات ثابت کر دی کہ پاکستان کے مسلمان اسلام کے ساتھ ہیں امام تیمیہ وغیرہ کے زمانے میں اس وقت کے حکمران یہ بطور طعن کہتے تھے کہ دیکھو ہمارے ماننے والے زیادہ ہیں یا تمہارے تو ان کے جواب میں یہ علمائے کرام فرماتے تھے کہ ہمارا اور تمہارا فیصلہ نماز جنازہ سے ہو سکے گا۔ اب اے لوگو! آگے بڑھنے کا موقع ہے۔ رونے دھونے کا موقع نہیں ہے۔ آج یہ دیکھ رہے ہیں کہ پاکستان، افغانستان، ایران وغیرہ میں جہاد جاری ہے۔ یہ نعرے بازی کا وقت نہیں ہے۔ بلکہ عمل کا وقت ہے۔ بس اے نوجوانو! اٹھو اور مولانا کی بتائی ہوئی شاہراہ پر گامزن ہو جاؤ۔

قطر کے قاضی القضاۃ عبداللہ محمود

حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا میں اس وقت آپ لوگوں کے سامنے اپنی طرف سے اپنے ملک کی اور اپنے ملک کے مسلمانوں کی طرف سے نمائندہ کی حیثیت سے حاضر ہوا ہوں۔ مولاناؒ کی وفات پر ہم سب لوگ آپ کو تعزیت پیش کرتے ہیں۔ اب ایسے لوگ دنیا میں آگئے ہیں جن کی کوششوں سے انشاء اللہ اسلام غالب آئے گا۔ مولاناؒ کی وفات پر زیادہ غم کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر چلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر مولاناؒ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو کیا حضورؐ اس دنیا سے رخصت نہیں ہو گئے۔ جب کہ پوری دنیا کو ان کی سخت ضرورت تھی۔ مولانا سے پہلے بہت سے مجدد گزرے اور اپنا مشن مکمل کرنے کے بعد اپنے رب سے خوشی خوشی جا ملے۔ جیسے حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ابن قیم وغیرہ۔

اب میں آپ لوگوں سے امیر جماعت پاکستان سے اور اس تحریک کے تمام وابستگان سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اسلام کی دعوت کو جاری و ساری رکھیں اور اس کو کامیاب بنائیں۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی اجر عظیم کے مستحق بنیں۔ اور مولانا کی روح کو بھی سکون پہنچائیں۔

عبدالعزیز المطوع

حمد وثنا کے بعد آپ نے فرمایا "بیشک مصیبت بہت زبردست وعظیم ہے اور یہ آزمائش نہیں بلکہ آتی رہتی ہے۔ ہر ایک کو اس کا غم ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد صحابہ کرام کے اندر کتنا اضطراب تھا۔ ان کے غم کو غلط کرنے کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ آیت فرمائی تھی ـــــ وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل۔ افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ط ومن ینقلب علی عقبیه فلن یضر الله شیئا و سیجزی الله الشاکرین ۵ اور وہ خود ہی مطمئن ہو گئے تھے۔ آج اپنا رنج و غم ہلکا کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ مولاناؒ نے دنیا کے اندر ایک ایسا گروہ تیار کر دیا ہے جو اسلام کا کام صرف عالم اسلام ہی میں نہیں، بلکہ پوری دنیا میں کر رہا ہے۔ اب میں آپ سب لوگوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ ایک دوسرے کا تعاون کریں۔ انسان بہت کمزور ہے اس کی کمزوری کی مثال ایک دھاگے جیسی ہے جب وہی دھاگہ اکٹھا ہو جاتا ہے تو وہ کپڑا بن جاتا ہے اور اس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اسی طرح جب انسان ایک دوسرے کا تعاون کریں گے تو انشاءاللہ ان کی دعوت کو کامیاب بنایا جا سکے گا۔

حسن البنا شہیدؒ کے صاحبزادے سیف الاسلام

حمد وثنا کے بعد آپ نے فرمایا: میں تعزیت پیش کرنے کیلئے حاضر ہوا ہوں تقریر کے لئے نہیں۔ یہ ایسا موقع ہے کہ میں اپنے جذبات پیش کر دوں۔ ان سے میری ملاقات ۱۹۵۲ء میں ہوئی تھی۔ بڑی عجیب ملاقات تھی۔ اس امت پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے کہ جب بھی اس امت پر شکوک و شبہات کے اثرات کھنچ جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ختم کرنے کے لئے اور احیائے دین کے لئے اس وقت اپنے نیک بندوں کو پیدا کرتا ہے۔

انہیں نیک بندوں میں سے حضرت ابوالاعلیٰ مودودیؒ بھی

بلکہ یوں کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا کہ آپ سب پر سبقت لے گئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔ اب میں ایک سیدھی بات آپ لوگوں سے کہنا چاہتا ہوں خصوصاً جماعت اسلامی پاکستان اور پاکستان کے مسلمان بھائیوں سے کہ وہ اس دعوت کو دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلائیں۔ اب آپ پر اس کی ذمہ داری پوری طرح پڑ گئی ہے۔ اور دنیا بھر کے مسلمان یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ کی کوششوں سے انشاءاللہ مسلمانوں کو عزت نصیب ہو گی۔ اور دنیا کے گوشے گوشے میں اسلام کا بول بالا ہو گا۔ اور آخر میں خود بھی آپ کو جماعت اسلامی کو اور طلبہ کو تعزیت پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر خورشید احمد صاحب

حمد وثنا کے بعد آپ نے فرمایا۔ مولانا کا آخری دیدار آپ لوگوں میں سے بہتوں نے کیا۔ سبھوں نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ آپ کا چہرہ چاند جیسا ہے۔ اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آپ سکون کے ساتھ گہری نیند سو رہے ہیں۔ ہمیں اب اچھی طرح یہ سمجھ لینا چاہئے کہ مولانا کی وفات ہو چکی ہے لیکن جب تک آپ کی کتابیں اور دعوت زندہ ہیں اس وقت تک مولانا زندہ ہیں مجھے یقین ہے کہ اسلام صرف پاکستان ہی میں نہیں پھیلے گا بلکہ پوری دنیا میں اس کا بول بالا ہو گا۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وفات پر کراچی، ملتان، فیصل آباد، لاہور وغیرہ میں جس طرح لوگ پریشان تھے، دنیا میں کسی [illegible] نقصان سے یہ اضطراب نہیں دیکھا گیا۔ اور آپ کے شیدائیوں میں زیادہ تر نوجوان ہی تھے۔ ایک درجن سے زیادہ جگہوں پر لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی۔ ان میں سے بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے نہ مولانا کو دیکھا ہے اور نہ ان کی آواز سنی ہے۔ یہ ہماری آزمائش کا وقت ہے۔ ہمیں اسلام کے فروغ دینے کیلئے پوری کوشش کرنی چاہئے۔ جس طرح سے مولانا نے جدوجہد کی تھی۔ انشاءاللہ ایک دن ہم یہ سعادت ضرور حاصل کریں گے جس کے لئے مولانا نے کوشش کی تھی۔ اب ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم

اس وعدہ کو پورا کریں جو ہم نے کیا ہے۔ تاکہ مولانا کی روح کو مکمل سکون نصیب ہو۔

میاں طفیل محمد صاحب

میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا کہ کچھ کہہ سکوں، صرف دو ایک باتیں میرا فرض ہے۔ میں اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ کوئی شک نہیں کہ جو لوگ ملک و بیرون ملک سے اس تقریبِ جلسہ میں شامل ہیں وہ ہم سے کم غمزدہ نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں اپنی طرف سے اور مولانا کے گھر کی طرف سے اس بات پر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس حادثہ کے بعد تھوڑی سی مدت میں ہم لوگوں کا اکٹھا ہونا اور طلبہ کے اس اجلاس نے ہمارے اس غم کو کم کر دیا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کرتا رہا کہ مجھے اس دن کے دیکھنے کی نوبت نہ آئے کہ میں مولانا کو یہاں سے رخصت ہوتا ہوا دیکھوں لیکن سوئے قسمت سے وہ دن آ پڑا۔

جب جماعت کی تاسیس ہوئی تو اس وقت میں چھٹا یا ساتواں شخص تھا جس نے مولانا کی آواز پر لبیک کہا۔ اور اسی وقت میں نے یہ عہد کر لیا تھا کہ میں مولانا کا کبھی ساتھ نہیں چھوڑوں گا چاہے لوگ آبادیوں سے بھگا دیں یا گھروں سے نکال دیں۔ ہم دین کا کام اسی طرح جنگل میں رہ کر کریں گے لیکن مولانا کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ شاید اسی عہد کو پورا کرنے کے لئے مجھے یہ دن دیکھنے پڑے کہ میں نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ وہ خود ہی ہم سے رخصت ہو گئے اور اپنے رب سے خوشی خوشی جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس عطا فرمائے

آمین

داعیٔ تحریکِ اسلامی

کیوں نہ لوگوں کے کلیجے ہوں وفورِ غم سے شق
اٹھ گیا ہے دیکھتے ہی دیکھتے وہ مردِ حق
جس نے ہر لمحہ گزارا مردِ مومن کی طرح
فخر کے لائق ہے جس کی زندگی کا ہر ورق
کانپ جاتا تھا صدا سے جس کی قلبِ اہرمن
جس کے رعب و دبدبہ سے چہرۂ باطل تھا فق
سینکڑوں شمعیں جلائیں جس نے راہِ زیست میں
کیوں نہ ہو ہم کو بھلا اس کے بچھڑنے کا قلق
عمر بھر جو دینِ حق کی راہ دکھلاتا رہا
جس نے لوگوں کو پڑھایا آدمیت کا سبق
کل تھا ہم میں آج ہے آرام فرما قبر میں
داعیٔ تحریکِ اسلامی رفیقِ اہلِ حق

انوار مسعودی

مرشدی مودودیؒ کے جنازے کا آنکھوں دیکھا حال

نسیم احمد فلاحی کی دھڑکتی تحریر

۲۲ستمبر ۱۹۷۹ء بروز سنیچر کو وہ شخص اس دنیا سے اٹھ گیا جو برسوں سے اس راہ پر چل رہا تھا جس کو اپنا کر زندگی کا زہر آب ہو جاتا ہے یہ وہ کٹھن راہ ہے جس پر اللہ کے بڑے بڑے پر عزم بندے اللہ تعالیٰ جل شانہ کا حقِ بندگی ادا کرنے کے لئے چلتے رہے اور جب وقت آیا تو سکونِ قلب اور ایمان کے ساتھ اپنے خالقِ حقیقی کے سپرد اپنی جان کر دی۔

سامراج کے دور میں کئی تحریکیں برائے احیاءِ اسلام اٹھیں کچھ دنوں کیلئے راہ شور ہوئی اور پھر اندھیرا ہو گیا سید احمد شہید کا جہاد ختم ہو گیا جمال الدین افغانی کی تحریک پان اسلام ازم سازشوں کا شکار ہوئی۔ ابوالکلام آزاد کی دعوت بھی چند روز تک مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرتی رہی۔ محمد علی جوہر کی خلافتِ راشدہ کی تحریک ختم ہوئی اقبال کی ضربِ کلیم بانگِ درا بھی دھیمی دھیمی سُر میں مسلمانوں کو سرگرمِ عمل ہونے کی تلقین کرتی رہی، غریبوں کو جگاتی رہی، کاخِ امراء کو ہلاتی رہی لیکن مسلمانوں پر افسردگی کی لہر ایسی طاری تھی اور ولولے ایسے سرد ہو چکے تھے کہ نشاۃِ ثانیہ کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے بعد یہ مردِ مومن اٹھا اور بھرائی آواز میں اپنے بھائیوں کو پکارنے لگا۔

مولانا مرحوم کے بڑے بھائی کا کہنا ہے کہ تقریباً چھ گھنٹے تک اس موضوع پر انکی گفتگو مرحوم سے ہوتی رہی اور وہ مولانا سے بتاتے رہے کہ یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے جس تحریک کو لیکر تم اٹھے ہو اس سے باز آجاؤ کیونکہ بڑے بڑے لوگ افسردہ دل ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ لیکن اس ساری افہام و تفہیم کے جواب میں اس مردِ مجاہد نے صرف یہ کہا

"اب وقت ضائع کرنے کا نہیں رہا مجھے یقین ہے کہ اگر میری آواز میں خلوص ہوا تو میرا جذبہ ناکام نہیں ہوگا۔"

مولانا مرحوم کے برادرِ بزرگ نے مزید سمجھایا کہ یہ وہ قوم ہے جو کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتی ، اس کی خدمت کے شوق سے باز آجائیں۔ گفتگو کے دوران مردِ مجاہد، مفکرِ اسلام کی آواز بھرا گئی اور انھوں نے اپنے بڑے بھائی سے کہا

"حالات بہت نازک ہو چکے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ جو سیلاب آنے والا ہے وہ ۱۸۵۷ء کے انگریزی اقتدار کے سیلاب سے بھی کہیں زیادہ مہلک اور تباہ کن ہوگا۔ مسلمانوں کو اس خطرے سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے اپنی ہمت کے مطابق میں انکی کچھ خدمت کرنے کی کوشش کرونگا۔"

غرض اس مردِ مجاہد نے اقامتِ دین کے اس داعی نے قوم کی خدمت کرنے کا تہیہ کر لیا۔

تقریباً ۱۹۲۲ء ہی سے تعمیرِ افکار اور اصلاحِ کردار کا کام شروع کر دیا اور اسی صبر آزما اور جگر سوز کام میں اسکی تربیت کی

لمحات میں پرنم تھیں اور ہر چہرہ اداس ویران اور پریشان
تھا۔ کار کے پیچھے وہ بڑی ویگن تھی جس میں مولانا
کا جسد خاکی رکھا ہوا تھا۔ ویگن کے دونوں جانب پاکستان
اور جماعت اسلامی کے پرچم لہرا رہے تھے۔ اس ویگن
میں میت کو دیکھ کر ہر سوگوار کا دل سوز و غم میں ڈوبا ہوا
تھا۔ جو آنکھ میت کی طرف اٹھتی اس میں آنسو چھلکنے لگتے
میت کے پیچھے بسوں کا طویل جلوس تھا جن میں ہزاروں
افراد سوار تھے یہ وہ عقیدت مند تھے جو ملک کے
دور دراز مقامات کے علاوہ بیرون ملک سے مرحوم کی
آخری رسومات میں شرکت کے لئے آئے تھے وہ بلند
آواز سے کلمہ طیبہ کا ورد کر رہے تھے۔ بسوں کی چھتوں
پر بھی عقیدت مند سوار تھے اب یہ جلوس گورنر ہاؤس تک
پہنچ چکا تھا۔ جہاں سڑک کے کنارے ہزاروں عقیدت
مند مفکر اسلام کی آمد کے منتظر تھے۔ جلوس جوں جوں
گورنر ہاؤس سے آگے بڑھتا گیا جلوس کے شرکاء کی
تعداد بڑھتی چلی گئی۔ جلوس فیصل چوک سے شارع فاطمہ
جناح کی طرف مڑ گیا یہاں بھی ہزاروں عقیدت مند سڑک
کے دونوں جانب کھڑے تھے۔ جلوس یہاں سے اچھرہ
کیطرف روانہ ہوا۔ اس سڑک پر نہ صرف سڑک کے دونوں
جانب بلکہ مکانوں، دوکانوں اور شاپنگ سینٹروں کی چھتوں
پر بوڑھے جوان، مرد عورتیں اور بچے کھڑے تھے۔ جن میں
بے شمار مرد اور عورتیں رو رو کر اپنے رہنما کی میت کو
گذرتے دیکھ رہے تھے۔ میت اچھرہ موڑ پر چھ بجے شام
مرحوم سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ کی رہائش گاہ
پہنچی۔ وہاں انسانوں کا ایک سمندر موجزن تھا۔ میت
پہنچتے ہی ہر طرف ایک کہرام بپا ہو گیا لوگ دھاڑیں مار
مار کر رونے لگے۔ ایک دوسرے سے گلے مل کر چیخیں مار مار
کر روتے رہے۔ قریبی بڑی بڑی عمارتوں کی مختلف منزلوں
پر سے ہزاروں سوگوار بوڑھے بچے، مرد و زن اس منظر
کو دیکھ کر اشک بار ہو گئے اور بے شمار لوگ عالم اسلام

کے عظیم رہنما کی تعلیمات کی روشنی میں صبر و قناعت سے کام لے
رہے تھے۔ تاہم کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشکبار نہ تھی فضا لوگوں
کا ایک بہت بڑا ہجوم کلمہ طیبہ اور اللہ اکبر کا ورد بلند آواز سے
کر رہا تھا جس سے فضا گونج اٹھی۔ لوگ غم و اندوہ سے نڈھال
ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر اقبال نامی ایک نوجوان غم کی تاب نہ
لاتے ہوئے بے ہوش ہو گیا نوجوانوں نے اسے ہوش میں
لانے کیلئے تمام جتن کئے مگر وہ ہوش میں نہ آیا تو اسے کار
میں ڈاکٹری امداد فراہم کرنے کیلئے ہسپتال پہنچا دیا گیا
مرحوم کی میت ان کی رہائش گاہ کی لان میں رکھ دی گئی۔ اس
کے بعد خواتین کو اپنے رہنما کا آخری دیدار کرنے کی اجازت
دی گئی۔ عشاء کی نماز تک ہزاروں خواتین مرحوم رہنما کا
آخری دیدار کرتی رہیں۔ خواتین کا اس قدر ہجوم تھا کہ نماز عشاء
کے بعد بھی خواتین کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ آخری دیدار
کرنے والی خواتین ایک طرف سے داخل ہوتی تھیں اور
دوسری طرف نکل جاتی تھیں بیشتر خواتین سسکیاں لیتی ہوئیں
باہر نکلتیں۔ خواتین کے بعد مردوں نے مرحوم کا آخری دیدار
شروع کیا یہ سلسلہ رات بھر چلتا رہا۔ صبح کی نماز کے بعد بھی
لوگ مولانا مرحوم کا آخری دیدار کرتے رہے میں اور میرے
کچھ دوستوں کو رات ہی میں ایک خصوصی انتظام کے تحت
جمیعتہ العلماء نے مولانا مرحوم کا دیدار کرا دیا۔ ہمیں اس
لمبی قطار میں لگنے نہ دیا جیسیں وہاں کے لوگ قطار میں
کھڑے تھے۔ پھر صبح کو ہندوستانی ڈیلیگیشن کے لئے مولانا
کو دیکھنے کا خصوصی انتظام کیا گیا۔ ہم لوگ مرکز منصورہ
اچھرہ بذریعہ بس پہنچ گئے وہاں ہم نے دیکھا وہاں بھی قطار
موجود تھی جو مولانا کے دیدار کیلئے چل رہی تھی۔ لوگ سراپا
درد و غم کی تصویر لگتے۔ ان کے آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے
مولانا مرحوم کی جسد خاکی کے پاس پہنچتے تو بعض کی ہچکیاں بندھ
جاتیں اور کچھ درد و غم سے بے ساختہ چیخ اٹھتے۔ جماعت
اسلامی ہند کے وفد نے بھی مولانا کا آخری دیدار اسی طرح کیا۔
ہمارے اپنے لوگ سسکیاں بھر رہے تھے۔ کچھ کی ہچکیاں

بند ہو گئی تھیں۔ بندہ خاکسار کا بھی یہی حال تھا۔ مولانا کا چہرہ انتہائی پرسکون جیسے معلوم ہوتا تھا کہ مولانا مرحوم گہری نیند سو رہے ہیں۔ کیا نورانی چہرہ تھا ماشاء اللہ جو دیکھے وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ یہ چہرہ مرد مجاہد اقامت دین کے داعی، متفکر اسلام ہی کا ہو سکتا ہے۔ ہم بہت دیر تک وہاں ٹھہرے رہے۔ ہمارے بہت سے ساتھی اور ہم خود وہاں کلمہ پڑھتے رہے اسی دوران میں بار بار اعلان ہوتا رہا کہ "اب صرف اتنے منٹ رہ گئے ہیں، ساڑھے آٹھ بجے دروازہ بند کر دیا جائے گا اس کے بعد قذافی اسٹیڈیم جانے کی تیاری ہوگی اور وہیں نماز جنازہ ادا کی جائے گی" لوگ باہر سے تیز تیز قدموں بنگلے میں داخل ہو رہے تھے۔ مولانا کو ایک نظر دیکھ کر روتے سسکتے اور چیخیں مارتے ہوئے باہر نکل رہے تھے۔ ہر شخص کا عجیب عالم تھا۔ گویا اس طرح لاکھوں افراد نے مرحوم کا آخری دیدار اور خراج عقیدت پیش کیا۔ اب مولانا مرحوم کے اہل خانہ ان کا آخری دیدار کرنے والے تھے۔ ہم لوگ مولانا مرحوم کے بنگلے کے لان میں جہاں وہ ایک مدت دراز تک اپنی عصری مجالس میں بیٹھا کرتے تھے وہاں آ گئے وہاں ایک کتبے پر لکھا ہوا تھا "تحریکی کام صرف اور صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے سوچ سمجھ کر فیصلہ یہ کیا کہ انہیں اپنی عمر عزیز اسی کام میں کھپانی ہے" مولانا کے بنگلے کے باہر کی گلی میں شاہراہ عام تک جا بجا مولانا کے یہ اقوال دیواروں اور کھمبوں پر کتبوں کی صورت میں آویزاں تھے۔ "ہر ایک کیلئے دینی درجات ہوں گے جیسے انھوں نے عمل کئے ہوں گے" "میں بندہ ہوں بندگی کرتا ہوں جب اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی رہنمائی حاصل ہے تو میں پھر کسی اور چیز کی طلب کیوں کروں۔ میری آخری نصیحت یہ ہے کہ وہ سب لوگ جو اس تحریک کے ساتھ ہیں خدا کے کام کو اپنی ذاتی کاموں پر ترجیح دیں" ایک جگہ یہ شعر بھی لکھا ہوا تھا۔

جمود سوز دروں سے ہے ٹوٹنے والا
حیات برف کی طرح پگھلنے والی ہے

مولانا کا جسد خاکی پی۔ آئی۔ اے۔ کی وین میں رکھا گیا اور قذافی اسٹیڈیم کی طرف نماز جنازہ کیلئے لاکھوں انسان جلوس کی شکل میں بڑھنے لگے۔ راستہ میں کلمہ طیبہ اور اللہ اکبر کا بلند آواز سے ورد مسلسل جاری رہا۔ تقریباً گیارہ بجے ہم سب لوگ قذافی اسٹیڈیم پہنچ گئے۔ قذافی اسٹیڈیم بہت بڑا تھا جس کے اندر جانے کیلئے مختلف سمتوں سے راستے تھے۔ میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ قذافی اسٹیڈیم میں داخل ہو گیا۔ میں نے اپنے لیے ایسی جگہ منتخب کر لی جہاں سے تمام عرب مہمانوں کو اور صدر جنرل ضیاء الحق کو بآسانی آتے اور جاتے دیکھ سکتا تھا اور دیکھا جس وقت مولانا مرحوم کی میت اپنی رہائش گاہ اچھرہ سے قذافی اسٹیڈیم لائی جا رہی تھی الحمدللہ میں نے برصغیر پاک کی بہت ساری شخصیتیں کھڑی سوار جا رہی تھیں۔ ان میں پاکستان کے امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد صاحب خلیل حامدی صاحب اور ان کے دیگر رفقاء تھے۔ اور ہندوستان کے امیر جماعت اسلامی ہند سابق امیر جماعت اور مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی سوار تھے۔

قذافی اسٹیڈیم میں اعلان ہوا کہ مولانا محترم کی نماز جنازہ میں شرکت کیلئے امریکہ، افغانستان، ایران، بھارت، عراق، شام، انگلستان اور سعودی عرب وغیرہ سے نمائندے تشریف لا چکے ہیں۔ اخبارات میں یہ خبر شائع ہو چکی تھی کہ مولانا کی نماز جنازہ امام کعبہ پڑھائیں گے۔ چنانچہ جیسے ہی عرب کا قافلہ گذرا تو میں نے سوچا کہ شاید اس میں امام کعبہ ضرور ہوں گے۔ مگر بعد میں [illegible] یہ اعلان ہوا کہ امام کعبہ [illegible] ان کی جگہ مولانا مرحوم کے ایک بہت ہی جگری دوست [illegible] قرضاوی نماز جنازہ پڑھائیں گے۔

قذافی اسٹیڈیم میں علامہ یوسف قرضاوی اور دوسری ممتاز شخصیتوں نے مولانا مرحوم کی زندگی پر مختصر روشنی ڈالی۔ علامہ یوسف قرضاوی نے صلاۃ وسلام کے بعد تقریباً ۲ لاکھ شیدائیان اسلام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا "ہم ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی صفت بیان کریں گے اور ہر حال میں ہر مصیبت ہر تکلیف میں اسی کی مدد طلب کریں گے۔ "میرے بھائیو میں قطر سے ازہر سے یا کسی دوسری جگہ سے اس لئے نہیں آیا کہ آپ کے سامنے مولانا محترم کے بارے میں اپنے غم بیان کروں۔ مولانا تو اس دنیا کے امام ہیں۔ اس نسل کے استاد ہیں۔ امت کے استاد ہیں وہ اس بات سے بلند ہیں کہ ہم ان کے لئے رنج و غم کا اظہار کریں۔ میں آپ کو صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ تمام دنیا کے مسلمان آج مولانا مودودی کے لئے رو رہے ہیں مولانا مودودی صرف پاکستان کے فرد نہیں۔ صرف عالم اسلام کے فرد نہیں۔ وہ پوری ملت اسلامی کے فرد ہیں اور یہ نقصان تمام مسلمانوں کا نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ اس نقصان کی تلافی فرمائے مولانا مودودی مرے نہیں ہیں۔ صرف ان کا جسد خاکی ہم سپرد خاک کر رہے ہیں۔ وہ زندہ ہیں اپنے افکار میں۔ اپنے اصولوں میں اور اپنی تحریروں میں زندہ و تابندہ ہیں۔ علامہ قرضاوی کے بعد ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ کے اسسٹنٹ سکریٹری جنرل ڈاکٹر احمد توتنجی نے کہا کہ

"میں نے کم و بیش نصف دنیا کا چکر لگایا ہے اور میں نے کوئی جنگل، کوئی شہر، کوئی یونیورسٹی ایسی نہیں دیکھی جہاں مولانا مودودی کے افکار ان کی اپنی زبان میں موجود نہ ہوں۔ ہم نوجوان مولانا مودودی کے افکار کو لیکر آگے بڑھیں گے بڑھتے رہیں گے۔"

اسٹیڈیم سوگواروں سے بھرا ہوا تھا۔ عرب مہمان بھی تشریف لا چکے تھے۔ جنرل محمد ضیاء الحق بھی تشریف فرما تھے۔ سب لوگ کرب و اضطراب میں مبتلا تھے۔ لاکھوں عوام کی موجودگی میں علامہ قرضاوی نے اللہ اکبر کہا اور اسٹیڈیم پر سکوت طاری ہو گیا چند منٹ میں نماز جنازہ ختم ہو گئی۔ اب تک کی تاریخ میں مولانا کو صرف یہ سعادت نصیب ہوئی کہ دنیا کے تین براعظموں میں میت کو سامنے لگا کر دس مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ دنیا کے گوشے گوشے میں ہزارہا بار نماز جنازہ غائبانہ پڑھی گئی۔ نماز جنازہ کے بعد یہ اعلان ہوا کہ امیر جماعت اسلامی پاکستان میاں طفیل محمد صاحب اور مولانا کے بڑے صاحب زادے ڈاکٹر احمد فاروق مودودی صاحب ایک اہم اعلان کریں گے مگر ہجوم کی وجہ سے لاؤڈر کا تار ٹوٹ گیا جس کی وجہ سے ان دونوں حضرات کے اعلان کا سات لاکھ افراد تک پہنچنا ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ اعلان کا پتہ نہ چل سکا۔ پھر وہی رقت شروع ہو گئی جو اچھرہ سے اسٹیڈیم تک لے جاتے وقت تھی۔ جگہ جگہ لوگ سیدی مرشدی، مودودی، مودودی اور نعرۂ تکبیر اور کلمۂ طیبہ سے پوری فضا گونجتی رہی۔ مولانا کا جنازہ آہستہ آہستہ اچھرہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسٹیڈیم میں لاؤڈ اسپیکر پر یہ گذارش کر دی گئی تھی کہ مولانا مرحوم کی رہائش گاہ تک جانے کے بجائے باہر سے ہی منتشر ہو جائیں کیونکہ لاکھوں افراد کا مولانا کی آخری آرام گاہ تک جانا کسی طرح ممکن نہ تھا ہم کچھ رفقاء سمیت اچھرہ کی طرف چل دیئے۔ جب وہاں ہم لوگ پہنچے تو دیکھا کہ دونوں دروازے بند کر دیئے گئے ہیں کچھ دیر تک پھر لوگ وہیں ٹھہرے رہے۔ پھر وہاں سے رشیدیہ پارک چلے گئے۔ یہ پارک مولانا کی قیام گاہ کے بالکل قریب دکھن جانب واقع ہے۔ اسی پارک میں منگل کے ۹ بجے رات میں ٹی۔ وی۔ پر لعل جلیل مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی کو دکھایا گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ مولانا مرحوم کا بنگلہ ان کا گھر جو ایک چھوٹا سی [illegible] معلوم ہوتا تھا۔ ان کی [illegible]

جب مولانا مرحوم کی شکل ٹی وی پر لیٹے ہوئے نظر آئی
لوگ ایک طرف سے سسکیاں لینے لگے اور کلمہ کا ورد بھی
لوگوں کی زبان پر جاری ہو گیا۔

بہرکیف ہم بدھ کے روز رشیدیہ پارک میں
ٹھہرے رہے۔ اور جب ہمیں معلوم ہوا کہ روشنی کا منار
عزم و استقامت کے پہاڑ کو سپرد خاک کر دیا گیا ہے فوراً
ہم مولانا مرحوم کی رہائش گاہ تکیہ پہنچے۔ جناب عارضی سے
ابدی ہو گئی تھی۔ بنگلے کے دونوں دروازے کھلے
ہوئے تھے اور لوگ قبر پر پہنچ کر فاتحہ پڑھتے آنسو
بہاتے اور پھر صبر و شکر کے ساتھ خاموشی سے باہر نکل جاتے
ہم لوگوں نے بھی تسلی دی اور کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد مرکز
منصورہ واپس چلے آئے۔

دوسرے دن جمعرات کو ایک تعزیتی جلسہ منعقد
ہوا جس میں تمام عرب مہمان اور ہندوستان، پاکستان
بنگلہ دیش، کشمیر اور بہت سارے ممالک کے لوگ شریک
ہوئے۔ سب لوگوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔
دوسرے دن جمعہ کو پھر ایک بار مولانا مرحوم کی ابدی
آرام گاہ پہنچ کر فاتحہ پڑھی گئی۔ اسی دن شام کو مرکز منصورہ
کی طرف سے تمام لوگوں کو شام کے کھانے پر جماعت
اسلامی لاہور نے مدعو کیا تھا۔ کھانے کے بعد ارکان
کی نشست کا بھی پروگرام چلا۔ دوسرے دن سنیچر کو ناشتہ
کرکے ہم لوگ آٹھ افراد پر مشتمل قافلہ گھر کے لئے روانہ ہوا۔
مرکز کی گاڑی سے ہم لوگ ایک گھنٹہ کے اندر واگا بارڈر
پہنچ آئے پھر انہیں ساری سہولتوں کے ساتھ کلین سے
دن میں امرتسر پہنچ آئے۔ راستہ میں قافلے میں مولانا
صدر الدین صاحب اصلاحی اور سید حامد حسین صاحب
بھی شامل رہے۔ ہم لوگ بڑی آسانی کے ساتھ اتوار
کی صبح کو دہلی مرکز پہنچ آئے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت
فرمائے، خدمات کو شرف قبولیت بخشے اور جنت الفردوس
میں اعلیٰ ترین مقام عطا فرمائے۔ مرحوم کے ورثاء اور
جملہ متوسلین کو صبر عطا کرے اور ان کو اور ہم سب کو
مرتے دم تک کتاب و سنت کی پیروی کی توفیق عطا
فرمائے۔ آمین

اختر ہوشیارپوری

مینارۂ نور

تو ادائے حرف و قلم بھی تھا — تو بصیرتوں کا بھرم بھی تھا
تری گفتگو میں مٹھاس بھی — تو رموز کار شناس بھی
کہ تو صرف ذوق سلیم تھا
در مصطفیٰ پہ مقیم تھا
تو ثبات اہل یقیں بھی تھا — تو فروغ دین متیں بھی تھا
کہ تو اک منارۂ نور تھا — جو تمام فکر و شعور تھا
جسے آندھیاں نہ بجھا سکیں
جسے ظلمتیں نہ مٹا سکیں
تو شکست موت سے کھا گیا — نہیں اپنے ساتھ بجھا گیا
تو گر حیات نشاں ہوا — تو جمال کا کہکشاں تھا
تری فکر ابد کا پیام ہے
تری آگہی کو سلام ہے

ارسال کردہ شبنم سبحانی
(صدر شعبہ اردو جی ایس یوسٹ گریجوٹ کالج سلطانپور)

مکتوب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بنام حاجی رشید الدینؒ ناظم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمال پور پٹھان کوٹ پنجاب
شمارہ ۷۲/۶۷
مورخہ ۳۱ دسمبر ۱۹۳۹ء

تحرمی و مکرمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عنایت نامہ مورخہ ۲۴ دسمبر بروقت مل گیا تھا لیکن ۲۸ دسمبر سے میرے ہاں ہندوستان کے مختلف حصوں سے بکثرت مہمان آگئے تھے اور اس درجہ مصروفیت تھی کہ میں کوشش کے باوجود آپ کو جواب لکھنے کے لئے وقت نہ نکال سکا۔ اب ادھر سے فارغ ہوتے ہی جواب عرض کر رہا ہوں، امید ہے کہ اس تاخیر سے درگذر فرمائیں گے۔

مولانا امین احسن صاحب کا تعلق مدرسہ اصلاح سے فی الواقع ویسا ہی استوار تھا جیسا جناب نے تحریر فرمایا ہے اور فی الحقیقت اب سے دو تین سال پہلے تک وہ خود بھی اس بات کا تصور نہ کر سکتے تھے کہ کبھی ان کا اور مدرسہ کا تعلق ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ لیکن اپنے مدت العمر کے مطالعے کتاب و سنت سے ہم لوگوں پر دین کی جو حقیقت کھلی ہے اور اس کے مطالبات و مقتضیات کا جو علم حاصل ہوا ہے اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمیں اپنے عزیز ترین اور محکم ترین تعلقات کو بھی دل پر پتھر رکھ کر صرف اس وجہ سے توڑنا پڑا ہے کہ دین کی خدمت کا جو راستہ ہمارے سامنے واضح ہو چکا ہے اس پر چلنے کے لئے آزاد ہو جائیں۔ ہم اب اس چیز سے بالکل مطمئن نہیں ہے کہ خدا سے پھری ہوئی اس دنیا میں بس کچھ لوگ خدا اور اس کے دین کا نام لینے والے موجود رہیں اور کفر سے مغلوبیت کی حالت میں جتنی گنجائش دین کے لئے رہ جائے اس کو تجو اپنے مذہبی اعمال و اقوال سے پر کرتے رہیں۔ ہمارے نزدیک یہ صورتِ حال نہ تو دینِ حق کو گوارا ہے اور نہ اس میں سچی دینداری زیادہ مدت تک زندہ رہ سکتی ہے۔ مگر ہمارے یہ مذہبی مدرسے جو آج کل ملک میں قائم ہیں، زیادہ سے زیادہ بس یہی خدمت انجام دے سکتے ہیں اور اس سے آگے کیلئے ان میں کچھ گنجائش نہیں ہے اس لئے جہاں ہم موجودہ صورت حال سے غیر مطمئن ہیں ان مدارس سے بھی ہمارا اطمینان اٹھ گیا ہے اور ان میں کام کرنے کو ہم اپنے وقت اور اپنی قوتوں کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ ہمارے سامنے ایک مقصد واضح طور پر آگیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کا دین غالب ہو اور کفر و کفار اس سے دب کر رہیں۔ حتیٰ یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون۔ اس مقصد عظیم کی خدمت میں صرف ہونا چاہئے۔ اس سے فروتر کاموں میں صرف کرنا حکمت کے خلاف ہے۔ لہٰذا بحالات موجودہ مولانا امین احسن صاحب کا آدھا وقت مدرسہ کے لئے وقف کرنا نہ تو میں ہی گوارا کر سکتا ہوں اور نہ مولانا خود گوارا کر سکیں گے۔ البتہ جو چیز ہم چاہتے ہیں اگر مدرسہ اصلاح وہی ہوتا

یا ہو سکتا تو آدھا وقت کیا معنی پورا وقت دل اور جان و مال سب کچھ اس کے لئے وقف ہو سکتا تھا۔

آپ جیسے مخلص و مشفق بزرگ کی بات رد کرتے ہوئے مجھے دلی تکلیف ہوتی ہے لیکن جو وجوہ میں نے اوپر عرض کئے ہیں ان پر نظر کر کے مجھے امید ہے کہ آپ میری معذرت قبول فرمائیں گے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

نوٹ:-

مولانا کا یہ مکتوب مجھے حاجی رشیدالدین کے خاندان کے ایک نوجوان سے اس وقت حاصل ہوا تھا جب کہ سنہ ۱۹۶۰ء میں میرا قیام مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں تھا۔

مولانا ابن حسن اصلاحی صاحب مولانا مودودیؒ کی دعوت پر مدرستہ الاصلاح سے اپنی تدریسی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر پٹھان کوٹ تشریف لے گئے تو اس وقت حاجی رشیدالدین مرحوم نے ادارہ میں ان کی کمی شدت کیساتھ محسوس کرتے ہوئے مولانا مودودی سے التماس کیا کہ انھیں مدرسے کی خدمات کیلئے خالی کر دیا جائے۔ حاجی صاحب کے اس مطالبہ کا جواب دیتے ہوئے قائد تحریک اسلامی نے یہ مکتوب تحریر فرمایا اور اس میں نہایت جامعیت اور وضاحت کیساتھ مولانا مودودیؒ کے مشن اور تحریک اسلامی کی بنیادی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مولانا کا روشن و تاثر انگیز منطقی و استدلال اور سادہ و سلیس مگر دل کی تہہ تک اتر جانے والا اور اپنے اندر پنہاں رکھنے والا اسلوب بھی اس مکتوب میں جلوہ گر ہے۔

سید عبدالباری شبنم سبحانی

(صدر شعبہ اردو - جی ایس یو سٹ گریجوٹ سلطانپور)

مولانا مودودیؒ کا ایک غیر مطبوعہ خط

مولانا نظام الدین اصلاحی کے نام

۱۹۶۳ء کے قریبی زمانہ کا واقعہ ہے کہ وحیدالدین خاں صاحب نے مولانا مودودیؒ کے افکار پر تنقید لکھنا شروع کیا اور "تعبیر کی غلطی" کے نام سے اس موضوع پر ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی۔ اور اس کتاب کو مختلف علماء کے پاس برائے مشورہ روانہ کیا۔ ان دنوں جماعت اسلامی کے مخالفین اس کتاب کو ایک "اہم کارنامہ" قرار دیکر پورے ملک میں پھیلا رہے تھے۔ اسی زمانہ میں میں نے مولانا مودودی کے پاس خط لکھ کر ان کا عندیہ معلوم کیا۔ کہ کیا وہ اس کتاب پر کچھ اظہار خیال فرمانا پسند فرمائیں گے۔ اس عریضہ کے جواب میں مولانا مرحوم فرماتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اچھرہ لاہور   جماعت اسلامی پاکستان

مورخہ ۱۱ رجمادی الثانی   حوالہ 2897 / 30-10-63

مکرمی و محترمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عنایت نامہ ملا "تعبیر کی غلطی" پر یہاں سے اظہار خیال کا ارادہ نہیں ہے۔ آپ لوگ اپنی صوابدید کے مطابق جس طرح چاہے کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس وہ کتابی شکل میں آئی بھی نہیں ہے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

دل کی پکار

باسمہ تعالیٰ

معرفت ہمدرد دواخانہ
سلطانپور
29/9/79

عزیزمن عبید اللہ فہد و رفقاء ادارہ حیات نو

سلام مسنون

آپ کا ارسال تازہ رسالہ کے ساتھ ہی اس سے قبل انصار احمد فلاحی صاحب کا خط بھی گذشتہ شمارہ کے ساتھ نظر نواز ہوا۔

ماشاء اللہ رسالہ کے اندر خاصا ارتقاء نظر آرہا ہے۔ طباعت و گٹ اپ کے اعتبار سے اور مواد و ترتیب کے پہلو سے بھی۔ ٹائیٹل ذرا اور معنی خیز اور سادہ ہونا چاہئے۔

مفکر اسلام اور بانی تحریک اقامت دین مولانا مودودی رح کی وفات کا اثر میرے دل پر شدت کے ساتھ ہوا ہے۔ میرے لئے یہ گہرا سانحہ اور ذاتی نقصان ہے۔ گذشتہ تیس سال یعنی ۱۹۴۹ء سے لیکر اب تک میں اپنی زندگی کا فکری و ذہنی سفر جس شخص کی رہنمائی میں کر رہا تھا آج اس سے محروم ہو گیا ہوں۔ پورے عالم اسلام اور ملت اسلامیہ کے لئے یہ ایک عظیم حادثہ ہے۔ بس تسکین کا ایک ہی پہلو ہے کہ وہ ایسے واضح نقوش راہ چھوڑ گئے ہیں جو کم از کم آئندہ ایک صدی تک جدید حالات و مسائل کی یلغار میں اسلام کے علمبرداروں کا قلم حق کی شاہراہ پر ثابت قدمی کے ساتھ گامزن بنائے رکھیں گے۔ اللہ ان کی خدمات قبول کرے اور اپنی بارگاہ اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا کرے اور ہم کو ان کے مشن کی تکمیل کی جد و جہد پر قائم رکھے۔ ضرورت ہے کہ آپ جیسے نوجوان اور متحرک و فعال ہو جائیں اور اپنے فکر و عمل سے وہی اضطراب، وہی بے چینی اور وہی انقلاب پیدا کریں جو اس عظیم داعی حق کی تحریروں اور اسکی شب و روز کی جہد مساعی کا خاصہ تھا۔

مولانا مودودی کا ایک نادر خط میں آئندہ آپ کو ارسال کروں گا جو غیر مطبوعہ اور ۳۵ سال پرانا ہے۔

والسلام

نیاز مند

سید عبدالباری

شبنم سبحانی

حجاب رامپور

۲۵ ستمبر ۱۹۷۹ء

عزیز گرامی انصار احمد فلاحی سلمہ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ حیات نو تازہ شمارہ ستمبر ۱۹۷۹ء ملا۔ ماشاء اللہ اس عمر میں آپنے ایسی صلاحیت پیدا کر لی کہ حیات نو جیسا بہترین پرچہ نہایت دلکش عنوانوں اور ٹھوس مضمونوں کے ساتھ ترتیب فرما دیا۔ میں نے جستہ جستہ اسے پڑھا ہے۔ بہت عدیم فرصت ہوں پھر بھی جو کچھ پڑھ سکا اسکے تاثیر سے زبان آپ کے لئے دعاؤں سے تر ہے۔ آپ کے فلاحی ساتھی بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جو بہترین تخلیقات سے آپ کی مدد کر رہے ہیں۔

والسلام
دعاگو
مائل خیرآبادی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۲۲ ستمبر
۱۹۷۹ء

برادرم محترم! ایدکم اللہ بنصرہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ماہنامہ "حیات نو" مجریہ ماہ ستمبر ۱۹۷۹ء جلد ۲، شمارہ ۹، موصول ہوکر باعث مسرت بنا جس کو اللہ تبارک مضامین کی عمدگی اور معیار کی بلندی دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ طلباء کی طرف سے ایسے معیاری ماہنامہ کی ضرورت تھی۔ شکر ہے کہ طلباء قدیم جامعۃ الفلاح نے اس ضرورت کو پورا کیا۔ فالحمد للہ علی ذلک۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اسے صحیح معنوں میں "حیات نو" بنائے اور ترقی بخشے۔ ابھی یہ نکھار اور توجہ کا کافی محتاج ہے

دو ہفتہ سے حبس بول کی شکایت میں مبتلا ہوں۔ آج سے پہلے شدید بے چینی تھی۔ اب الحمد للہ قدرے سکون ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ غدود متورم ہوگئے ہیں یا پتھری ہے۔ جس کے لئے آپریشن ضروری ہے۔ صحیح اندازہ ایکسرے سے ہوسکے گا۔ دعا فرمائیے اللہ تعالیٰ مجھے صحت کامل عطا فرمائے اور میری مغفرت فرمائے آمین۔ آپ کو یہ خط میڈیکل کالج سے تحریر کر رہا ہوں۔ یہاں سے نکلنے کے بعد اس مفید ماہنامہ کی توسیع اشاعت کی پوری پوری کوشش کروں گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ ذیل کی تحریر استاذ محترم مولانا جلیل احسن صاحب کو دکھا دیں۔ ادارہ کے متعلقین کو ہدیہ تبریک وسلام پیش ہے۔

محتاج دعا
محمد امین اثری از علی گڑھ

۲۸۹

۲۸ ستمبر
۱۹۷۹ء

برادرم! اسلام فزادلہ

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ کئی دنوں سے خط لکھنے کی سوچ رہا تھا لیکن نہ لکھ سکا۔ تاج کمبلا پو میں "حیات نو" سرسری طور پر دیکھنے کو ملا ماشاء اللہ روز افزوں ترقی پر ہے۔ خدا معیار اور سرکولیشن کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے۔ پتہ نہیں مجھ غریب کو آپ لوگ کیوں نظر انداز کئے دیتے ہیں۔ نہ تو کبھی پرچہ ہی بھیجتے ہیں اور نہ محبت کی دو سطریں۔ شاید میرا ہی کوئی جرم ہو۔ ان دنوں آپ لوگ شاید کانپور کی کانفرنس کے سلسلے میں مشغول ہوں گے۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے جنازے میں شریک ہونے کے لئے انجمن کی شوریٰ نے کسے بھیجا تھا نام معلوم نہ ہوسکا۔ ہمارے نمائندے نے وہاں کیا دیکھا سنا؟ واقعی مولانا مرحوم کے وصال سے جو خلا پیدا ہوگیا ہے شاید پر نہ ہوسکے پوری دنیا میں تحریک اسلامی کے افراد خود کو یتیم محسوس کر رہے ہیں اور ہر شخص یہی سوچتا ہے

آج مجھ کو معلوم ہوا یتیمی کیا ہے۔

امام احمد بن حنبل نے حاکم وقت سے کہا تھا کہ ہماری موت یہ فیصلہ کردے گی کہ لوگ کس سے محبت کرتے ہیں۔ آج مولانا مرحوم کے دشمن اچھی طرح محسوس کر رہے ہوں گے کہ اسلامیان عالم کے دلوں میں کس کی محبت زیادہ تھی۔ مولانا مرحوم کی یا ان کے دشمنوں کی۔ اسلام کے اس عظیم فرزند کی موت پر اظہار غم کی بجائے بہت سے نام نہاد دینی حلقوں میں خوشیاں منائی گئیں۔ خود دشمہ یا نجی میں مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ ۲۳ ستمبر کو جب نماز عصر کے بعد ڈاکٹر فتح اللہ کی مسجد میں درس حدیث کا پروگرام نہ چلانے دیا گیا بلکہ مین روڈ سے غنڈوں کو بلا کر افراد جماعت پر حملہ کرکے انہیں زدو کوب کیا گیا۔ گویا مسجد میں درس حدیث نہ دی جائے درس قرآن نہ دیا جائے، مولانا مرحوم کی وفات پر تعزیت نہ کی جائے لیکن ایسے غنڈوں کو جن میں سے بعض کے منہ سے شراب کے بھبکے نکل رہے

کوثر اعظمی، کوثر پریس سرائے میر اعظم گڑھ

ابو الاعلیٰ

تو ہی تنہا اک دیا تھا وادیٔ ظلمات میں
دم بہ دم جلتا رہا، گھرتا رہا خطرات میں
تند رو جھونکے چلے تجھ کو بجھانے کے لیے
ابر اٹھے گھر گھر کے تیری ضو چھپانے کیلئے
کاٹنی چاہی تری لو برق کی تلوار نے
راستہ روکا شعاعوں کا تری کہسار نے
آندھیاں چلتی رہیں، طوفاں یاد آتے رہے
گھن گرج کے ساتھ اپنا زور دکھلاتے رہے
کنج زنداں کی فصیلوں نے بھی گھیرے میں لیا
سایۂ دار و رسن نے بھی ترا نرغہ کیا
پے بہ پے مارا سبھی نے سر بعد شوریدگی
پھینکتے تجھ پہ رہے بڑھ بڑھ کے دام تیرگی
تیری کرنوں کو بہت چاہا دبا لینا، مگر
تشنگی تو تری بنتی گئی رقص شرر
تیرگی کو چیرتی، ظلمت کو لرزاتی ہوئی
صورت برق جہندہ ہر سو لہراتی ہوئی
دب نہ پائی جہدِ رم تیری بہ جوش التہاب
کر گئیں تیری ضیائیں رات کا خانہ خراب

تیرے آگے سب نے کھائی منہ کی تو بالا رہا
تو ابو الاعلیٰ تھا شاہد وقت ہے اعلیٰ رہا

اے ابو الاعلیٰ! امین عظمت ناموس دیں
آفریں بر جرأت اظہار حق تو آفریں
تیری سربازی نے رکھ لی غیرت ملی کی لاج
کانپ اٹھے ہیبت سے تیری صاحبان تخت و تاج
لاکھ یہ جرأت تری ازموم ٹھہرائی گئی
تیوریاں بدلیں، نگاہ و تیز برمائی گئی
دیکھ کر بڑھتی مسلسل تیری شان اعتبار
دھوپ دھارے ابتلا نے تیری خاطر صد ہزار
غیر تو تھے غیر، تجھ سے اپنے بیگانے ہوئے
اجنبی بنتے گئے، ایک ایک پہچانے ہوئے
خیر مقدم کر رہے تھے جو ترا تحسین سے
کام ان کو رہ گیا بس اک تری توہین سے
انگلیاں اٹھیں تری جانب اشارے بھی ہوئے
کور چشموں میں ترے وارے نیارے بھی ہوئے
بارش سنگ ندامت پے بہ پے تجھ پہ ہوئی
"قدسیوں" کے مورچے سے توپ فتوے کی دغی
دین و ملت سے ترے رشتے کو کاٹا بھی گیا
سنگ نفرت سے ترے رستے کو پاٹا بھی گیا

فیصلہ کرنے کا حق تھا رب کا جو، چھینا گیا
کینہ توزوں کا نہ پھر بھی لطف سے کینہ گیا

سنسناتے سنگ جب ہر موڑ سے آنے لگے
تیرے اپنے ہمعناں بھی کنّی کترانے لگے

ہمسفر کتنے ہی تیرے چھوڑ بیٹھے راستہ
چوم کر ہاتھوں کو تیرے توڑ بیٹھے واسطہ

تجھ سے ٹکرائے پرستارانِ باطل بار بار
یا نگاہِ خشمگیں و باغرورِ شہریار

گونج اٹھا شورِ سلاسل، جبر کی کڑکی کماں
خون تیرا چاٹنے کو تیغ کی لپکی زباں

قیدیِ زنداں بنا تو قیدِ تنہائی ملی
تیری قسمت دار کی تجھ کو پذیرائی ملی

دلشکن یہ مرحلے یہ جاں گُسَل سانحے
پے بہ پے ہر گام تیرے سامنے آتے رہے

آفریں ہر لو کہ تو نے خندہ پیشانی کے ساتھ
مسکرا کر سہہ لیا سب کچھ یہ آسانی کے ساتھ

اُف نہ کی تو نے نہ آئے تیری پیشانی پہ بل
بے نیازانہ رہا تو پھر بھی سرگرمِ عمل

والہانہ اپنی دھن میں جانبِ منزل رواں
سینۂ صحرا پہ کرتا ثبت قدموں کے نشاں

از پئے حق ہوگئے تو نے دہر میں سینہ سپر
رکھ دیا پھر توڑ کر اک مرتبہ باطل کا سر

اک زمانہ اب ہے گرویدہ ترے افکار کا
فیض ہے سارا یہ تیری عظمتِ کردار کا

کھنچ رہا ہے ایک عالم حلقۂ اسلام میں
گونج ہے تیری اذاں کی عرصۂ ایام میں

پھر پلٹ آنے کو ہے اب عہدِ رفتہ کا شباب
راحتِ جانِ جہاں، عہد آفریں وہ انقلاب

منتظر ہے ایک دنیا دیر سے جس کے لئے
پھر فروزاں ہونگے بزمِ دل کے افسردہ دیے

پھر جہاں پر نور ہوگا بارشِ انوار سے
امن کی پھوٹیں گی کرنیں ہر در و دیوار سے

پھر بہار آئے گی ہوگا جشنِ گل کا اہتمام
پھر نشاطِ نو سے ہوگی آدمیت شادکام

پھر رضا رب کی بنے گی نظمِ عالم کی اساس
پھر زباں زد ہوگا ہر سو کلمۂ شکر و سپاس

سربلند ہوگا جہاں میں رایتِ اسلام پھر
باعثِ تسکینِ دل ہوگا خدا کا نام پھر

پھر سجے گی تشنہ کامانِ وفا کی انجمن
گل بداماں ہوں گے پھر سب چاک داماں چمن

پھر چمن ہوگی روشن شمعِ لالہ کو بہ کو
پھر خدا کے دین کا ہوگا بول بالا چار سو

السلام اے بانیٔ تحریکِ تسلیم و رضا
السلام اے داعیٔ حق، سالکِ راہِ وفا

السلام اے حوصلہ جو قافلہ سالارِ حق
واقفِ راہِ ہدایت، کاشفِ اسرارِ حق

السلام اے ماحیٔ طاغوت و جہلِ روزگار
خوگرِ صبر و رضا اے حلم کے کوہِ وقار

السلام اے تاجدارِ کشورِ تجدیدِ دیں
السلام اے نازشِ اسلام، فرزندِ جبیں

السلام اے غازیٔ جانباز مردِ سرفروش
بے جگر، خارا شگاف و محنتِ جاں سخت کوش

السلام اے کشتۂ تیغِ جفائے سرکشاں
سربراہِ جانثاراں، حامیٔ اسلامیاں

السلام اے صالح طینت اے حریف منکرات
اے سراپائے عزیمت، پیکر صبر و ثبات
السلام اے مرد حق آگاہ اے بطل جلیل
حامل خلق محمدؐ، صاحب عزم خلیلؑ
السلام اے باغبان کشت زار آرزو
اے کہ تھی تجھ سے عبادت دین حق کی آبرو

السلام اے جاں نثار دین و ملت السلام
اے کہ وابستہ تھا تجھ سے دین قیم کا قیام

تو نہیں ہم میں تو کیا، زندہ ترا پیغام ہے
دل میں احساس وفا، لب پہ خدا کا کام ہے
تیری صورت جان جائے گی وفا کی راہ میں
زندگانی وقف ہوگی بس خدا کی چاہ میں
تو رضا جوئے رضائے رب تھا رب سے جا ملا
گوشۂ خلد بریں ہو تیری خدمت کا صلا
رحمت رب جہاں تجھ پہ رہے سایہ فگن
لہلہائے تا ابد تیری امید دل کا چمن

بہر عالم ذات تیری جلوۂ خورشید ہے
سچ تو یہ ہے مر کے بھی تو زندۂ جاوید ہے

اے ابو الاعلیٰ

تری فکر رسا نے خاک کے ذروں کو چمکایا
کہ تو نے سچ فلک سے چاند تارے توڑ کر لایا
سبق تبلیغ دین حق کا اس خوبی سے دہرایا
غریبوں کو بھی دعوت دی، امیروں کو بھی سمجھایا
وہ شدت قید تنہائی کی، وہ گرمی، وہ تاریکی
مگر اس پر بھی تیرا غنچۂ خاطر نہ مرجھایا
تری فطرت میں ہے سنجیدگی بھی، استقامت بھی
مسرت میں نہ اترایا مصائب میں نہ گھبرایا
جہاں جس کی ضرورت تھی وہی تدبیر کی تو نے
کہیں کشتی کو جنبش دی کہیں موجوں کو ٹھہرایا
تری تحریر کا ہر لفظ اک روشن شہادت ہے
کہ تو نے کس قدر دشوار تر عقدوں کو سلجھایا
ترے انفاس میں خوشبو ہے گلہائے شریعت کی
کہ جس نے محفلیں کیا قید خانوں کو بھی مہکایا
بہر عنوان نادانوں نے تجھ پر تہمتیں جوڑیں
تری تحریر کو اٹھا، تری باتوں کو الجھایا
وہاں خود دعوت حق کیلئے تیرے خوشہ چیں پہونچے
جہاں کچھ روشنی دیکھی جہاں سوز جگر پایا
ترے دل کا سفینہ گیا سکوں نا آشنا نکلا
کبھی طوفاں سے الجھایا، کبھی ساحل سے ٹکرایا
تری تقریر پہ اردو زباں "خدا آفریں" بولی
نگارش پر تری تحسین ادب نے ناز فرمایا
جزاک اللہ! دماغوں کو عطا کی فکر قرآنی
جزاک اللہ! دلوں کو سوز ایمانی سے گرمایا
فسردہ ہو نہیں سکتے، کسی سے دب نہیں سکتے
وہ شعلے جن کو تیری جنبش داماں نے بھڑکایا

یقیناً اس تری جرأت کو دنیا یاد رکھے گی
سزائے موت سن کر بھی نہ پیشانی پہ بل آیا

مظہر القادری

حاجی محمد یار خاں (پاکستان)

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

۳۰ ستمبر ۱۹۷۹ء کو انجمن طلبہ اور انجمن فاضلین ادارہ تعلیم و تحقیق جامعہ پنجاب لاہور میں مولانا مودودیؒ کی یاد میں تعزیتی اجلاس میں یہ نظم پڑھی گئی

کس قدر مغموم ہیں دل حوصلہ پاتا نہیں
باوجود اپنی لطافت کے جہاں بھاتا نہیں

تیری شخصیت نہ تھی زندگی ایک فرد کی
وائے محرومی ضرورت تھی ابھی اس مرد کی

ملتِ اسلام پہ تیرے بڑے احسان ہیں
صدق دل سے اے ابوالاعلیٰ ترے قربان ہیں

تیرے اسلامی تصور کی ہیں سب روشن دلیل
تیری تحریریں تصانیف اور فرمانِ جلیل

صرف پاکستان والے ہی نہیں ہیں سوگوار
موت پر تیری سبھی مسلم ممالک اشکبار

جامعہ ہذا کی جمعیت شریک غم ... رہی
قوم کی ہر آنکھ میت پر تری جب نم رہی

روک دیں گے ظلم و استبداد کی یلغار کو
سامنے رکھ کر حکیمانہ تیرے افکار کو

تیری یادوں کے دیئے سے روشنی پائیں گے ہم
اس دیئے کی روشنی کو اور پھیلائیں گے ہم

موت نے گو جسم تیرا دور ہم سے کر دیا
ہاں دلوں میں ایک پاکیزہ تصور بھر دیا

احمد ناشاد کی مشکل میں آسانی کرے
آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

ابوالمجاہد زاہد

سورج ڈوب گیا

(مولانا مودودیؒ کے سانحۂ ارتحال سے متاثر ہو کر)

اے مرے ڈوبنے والے سورج!
(تجھ پہ اللہ کی رحمتیں ہوں
آج تیری جدائی میں صرف ایک میں ہی نہیں
میرے جیسے خدا جانے کتنے ہی افراد و اشخاص گریہ کناں ہیں
جن پہ بھی تیری کرنیں پڑیں
جن کی راہوں کو تو نے منور کیا
جن کو تاریکیوں سے نکالا
جن کی فکر و نظر کو... اجالا
آج وہ سب تجھے رو رہے ہیں
خطۂ پاک ہو یا کہ ہندوستاں
مصر ہو شام ہو یا کہ ایران ہو
الغرض شرق سے غرب تک
کیا عرب، کیا عجم، ہر جگہ، ہر طرف
تیرا ماتم بپا ہے
آج تیری جدائی میں سب رو رہے ہیں

○

کتنی ہی سرخ، پیلی، سیہ آندھیاں
سرخ، پیلی، سیہ گرد اڑاتی رہیں
گرد کا ایک طوفاں... اٹھاتی رہیں
تاکہ تجھ کو چھپا دیں
تیری تابانیوں کو مٹا دیں

تو مگر شان سے جگمگاتا رہا
ہر طرف سبز کرنیں لٹاتا رہا
کتنے جھگا ڈروں نے یہ چاہا کہ تجھ کو بجھا دیں
پھیر دیں تیرے چہرے پہ کالک
تو مگر شان سے جگمگاتا رہا
ہر طرف اپنے جلوے لٹاتا رہا..........

○

اے مرے ڈوبنے والے سورج
یہ یقیں ہے کہ تو ڈوب کر بھی
اپنے جلوے لٹاتے رہے گا
اپنی روشن کتابوں کی پر نور سطروں میں، تابندہ حرفوں میں
تو جگمگاتا رہے گا
اپنی فکر و نظر کی دلآویز کرنوں میں تو مسکراتا رہے گا
تیری تحریک نور و تجلی
پھیلتی اور بڑھتی رہے گی
تو دماغوں میں روشن رہے گا
تو دلوں میں یقین اور ایماں کے شعلے اگاتا رہے گا
اے مرے ڈوبنے والے سورج!
تجھ سے راضی رہے تیرا مالک
تجھ پہ اللہ کی رحمتیں ہوں

مولانا مودودی علیہ الرحمۃ

جہاں سے قائدِ ملت چلا گیا افسوس　　　وہ ایک مرشدِ جاں کار تھا زمانے میں
کہاں سے اب ملے فکر و نظر کو تابانی　　　وہ مہرِ فکر ضیا بار تھا زمانے میں

کچھ آج ہم ہی نہیں لاکھوں دل تڑپتے ہیں
جوان و پیر سبھی مضمحل تڑپتے ہیں

وہ ایک سیلِ جواں سال تھا بڑھاپے تک　　　وہ حسنِ جرأت و ہمت کا ایک پیکر تھا
نگارشات کا ہیرو، مفکرِ دوراں　　　وہ بحرِ فکر و معارف کا ایک گوہر تھا

اسے میں عالمِ عالی مقام کہتا ہوں
جہانِ فکر و نظر کا امام کہتا ہوں

مری نظر میں تھا بحرِ علوم مودودیؒ　　　کہ جس کے علم و تدبر کا ڈنکا بجتا ہے
مجھے بھی موت سے اس کی بڑا ہوا صدمہ　　　کلیجہ آج بھی رہ رہ کے کتنا دکھتا ہے

الٰہی کوئی عطا کر ہمیں بدل اچھا
جہاں کی ٹھیک قیادت کرے قلم جس کا

ابھی تو دل ہے پریشان و بےخود و بےتاب　　　ابھی تو ذہن میں طوفان ایک برپا ہے
ابھی تو صدمۂ پنہاں سے دل ہے بے قابو　　　ابھی تو یاد سے ہی دل مرا ابلتا ہے

ابھی تو شورشیں کیا کیا ہیں بحرِ ہستی میں
سکوں نہیں مجھے ملتا ہنوز کشتی میں

میں آج اس گلِ رنگیں کا ذکر کرتا ہوں
کہ جس کی نکہتِ دل کش فضا میں ہے ہر سو
وہ ایک پھول تھا جس میں تھیں نکہتیں صد ہا
جہاں کو ملتی رہی وقت پر ہر اک خوشبو

چمن میں آج معطّر ہوائیں چلتی ہیں
مشامِ فکر کے شیشے میں ہو کر ڈھلتی ہیں

وہ پھول تھا کہ چمن میں چراغ تھا کوئی
شبِ سیاہ میں جس سے ہے روشنی اب تک
وہ عندلیب تھا پیغامِ نو بہارِ چمن
کہ گونجتی ہے یہاں اس کی راگنی اب تک

وہ شمع و گل تھا یا نغمہ نوازِ بلبل تھا
دہن سے اس کے جو نکلا وہ جلوۂ دل تھا

وہ ایک ابر تھا پیہم برس رہا تھا جو
خزاں کے وقت بھی شاداب ہے چمن جس کر
گلوں میں تازگی، پودوں میں ہے نمو کیا کیا
روش روش میں نمایاں ہے اک پھبن جس سے

چمن میں ہر طرف گلہائے تر مہکتے ہیں
گلوں کے ساتھ عنادل بھی اب چہکتے ہیں

وہ کیا تھا ایک ستارہ تھا علم و دانش کا
کہ جس کی اوج تھی اوجِ کلیم و بینش
ہر ایک سمت ہیں جلوہ طرازیاں اس کی
ضیائیں جس کی جہاں میں ہیں رہبرِ دانش

برس رہی ہے ابھی جس سے روشنی پیہم
کہ جس سے ظلمتِ الحاد کر رہی ہے رم

وہ باغِ فکر و نظر کی بہار تھا گویا
وہ جس سے باغِ نظر میں ہے زمزمی پانی

وہ عہدِ نو کے چمن میں خزاں زدہ پودے　　چمن میں مضمحل جو کر رہے تھے مہمانی

اسی کی فکر و نظر سے وہ آج تانے ہیں

عذارِ فکر پہ حسنِ نظر کا غازے ہیں

جو سچ کہو تو تفکر کا آفتاب تھا وہ　　ہے اس کے فیض سے فکر و نظر میں تابانی

طلوعِ صبحِ خلافت میں اس کی تحریریں　　نکل چکی ہے جہادوں میں اب مسلمانی

اندھیری شب میں اجالے عطا کیے اس نے

اندھیری راہوں میں روشن کیے دیے اس نے

لہو میں اس کی نگارش کی اتنی گرمی ہے　　کہ ملک ملک میں بوڑھے بھی نوجواں ہیں آج

وہ جو کہ سرد تھے اپنے شباب میں یکسر　　وہ اب تو پیری میں ہر دم رواں دواں ہیں آج

اب اس کے زورِ قلم نے یہ تاب بخشی ہے

رجالِ فکر و نظر کو شراب بخشی ہے

جھلس رہے تھے جو پودے ہوائے مغرب سے　　تو ان کی ابرِ نگارش نے آبیاری کی

نسیمِ فیضِ تکلم نے دی ہوائے خنک　　تری و تازگی رگ رگ میں ان کی جاری کی

تڑپ کے رہ گئے الحادیانِ فتنہ طراز

رکی رکی سی ہے الحاد کی نئی پرواز

چمن میں اب نہیں پہلے سی ترکتازِ سموم　　ہوائے گرم سے اب تازگی نہ گھٹتی ہے

یہ روک ٹوک سے بچ کر چل نہیں سکتی　　سموم خود ہی تر و تازگی سے کٹتی ہے

چمن میں صرصرِ الحاد کا اثر کم ہے

اب اس کا اپنے ہی حلقوں میں ناک میں دم ہے

وہ اپنے افکار کی روشنی میں، اپنی تحریروں کے پردے میں، اپنی تقریروں کے آئینے میں، زندہ رہیں گے۔

قائدِ تحریکِ اسلامی کی وفات پر ریڈیو پاکستان کا خصوصی فیچر

سنہ ۱۹۲۶ء کا زمانہ ہے، برِ عظیم میں شدھی تحریک زوروں پر ہے، شدھی تحریک کا بانی سوامی شردھانند قتل ہوتا ہے اور پھر مسلمانوں کے دشمن اسلام کے خلاف بے بنیاد الزامات کا ایک طوفان کھڑا کرتے ہیں۔ انہی دنوں دلی کی جامع مسجد میں مولانا محمد علی جوہر جمعہ کا خطبہ دیتے ہیں اور رقت بھری آواز میں سامعین سے اپیل کرتے ہیں کہ ہے کوئی اللہ کا ایسا بندہ جو اسلام کے صحیح تصورِ جہاد پر ایک مدلل کتاب لکھے۔ اجتماع میں ۲۳ برس کے ایک نوجوان پر اس تقریر کا گہرا اثر ہوتا ہے اور وہ فیصلہ کرتا ہے کہ جہاد کے موضوع پر ایک جامع کتاب لکھے گا اور پھر ایک سال کے اندر ۱۹۲۷ء میں ایک کتاب "الجہاد فی الاسلام" کے عنوان سے شائع ہوتی ہے۔ اس کے مصنف تھے، سید ابوالاعلیٰ مودودی، جو بعد میں اسلام کی اولین صداقتوں اور وسعتوں میں جذب ہو کر رہ گئے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ریڈیو پاکستان سے اسلامی جہاد کی وضاحت کرتے ہیں۔

"تمام فقہائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ جب اسلام اور مسلمانوں کے کسی علاقے پر کوئی دشمن حملہ آور ہو تو ہر مسلمان پر فرداً فرداً جہاد فرض ہو جاتا ہے، اور یہ فرض نماز اور روزے کی طرح فرضِ عین ہے، بلکہ قرآن مجید تو ایسے موقع پر جہاد ہی کو مسلمان کے ایمان کی صداقت کا معیار قرار دیتا ہے، دار اسلام کو دشمن سے بچانے کا سوال جب پیدا ہو جائے تو قرآن کی رو سے اس وقت مسلمان کی صداقت ایمانی کا فیصلہ ہی اس بات پر ہوگا کہ وہ مدافعت میں اپنی جان اور مال کھپانے کے لئے تیار ہوتا ہے یا نہیں؟ جو شخص اس آڑے وقت میں جہاد کرنے سے جی چرائے اور جان و مال کی قربانی سے دریغ کرے اس کی نمازیں اور اس کے روزے سب بے کار ہیں، ان نمازوں اور روزوں کے باوجود قرآن اس کو منافق قرار دیتا ہے۔

مسلمان اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ موت اور زیست خدا کے ہاتھ میں ہے، وہ جانتے ہیں کہ جس شخص کی موت کا وقت آ گیا ہو اسے کوئی طاقت بچا نہیں سکتی، جس کی موت کا وقت خدا کی طرف

سے نہ آیا ہو اسے دنیا کی کوئی طاقت مار نہیں سکتی، وہ جانتے ہیں کہ موت کے معنی مر کر فنا ہو جانے کے نہیں ہیں، بلکہ اس کے بعد ایک دوسری اور ابدی زندگی کا دور شروع ہو جاتا ہے، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے لئے دنیا سے لے کر آخرت تک کامیابی ہی کامیابی ہے۔ اگر وہ زندہ رہے تو ایمان کے ساتھ زندہ رہیگا جس سے زیادہ عزت کی زندگی اور کوئی نہیں اور اگر وہ مرجائے تو شہادت کی موت مرے گا جس سے بہتر موت اور کوئی نہیں۔ یہی سمجھ مسلمان کو وہ طاقت عطا کرتی ہے جو کافر کو نصیب نہیں ہو سکتی، ایک سچا مسلمان سچائی کے لئے لڑتا ہے، حق مارنے کے لئے نہیں بلکہ حق کی حفاظت کے لئے لڑتا ہے، اس لئے اپنے برسر حق ہونے کا شعور اسے ان لوگوں کے مقابلے میں دس گنا زیادہ طاقتور بنا دیتا ہے، جو باطل کے لئے برسر پیکار ہوتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ مسلمان کو محض اپنے حق پر ہونے کا شعور ہی حاصل نہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ اس کے اندر صبر بھی ہو، یعنی وہ راہ خدا میں ہر خطرے کا مقابلہ کرنے، ہر تکلیف برداشت کرنے، ہر مصیبت سہ جانے کیلئے تیار ہو اور دشمنوں کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کے پائے ثبات میں تزلزل پیدا نہ کر سکے۔

اب ضرورت ہے کہ پاکستان کا ہر مسلمان اس ملک کو جو برصغیر ہند میں اسلام کا قلعہ ہے اور جس کی پوری زمین ہمارے لئے ایک مسجد کا حکم رکھتی ہے، بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینے پر آمادہ ہو جائے۔

رَبَّنَآ أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۳ رجب ۱۳۲۱ھ ہجری یعنی ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔

ان کے والد سید احمد حسنؒ حیدر آباد میں وکالت کرتے تھے، وہ سرسید کے عزیز تھے، اس لئے وہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ابتدائی دور کے طالب علموں میں سے تھے۔ مولانا مودودیؒ کا سلسلہ نسب حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی سے ملتا ہے، اس خاندان کے ایک نامور بزرگ حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی چشتی سکندر لودھی کے زمانے میں ہندوستان آئے اور شاہ عالم کے زمانے میں یہ خاندان دہلی میں آباد ہوا، مولانا مودودیؒ نے ایک پاکیزہ اور مکمل مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی۔ والدین نے بچپن ہی سے ابوالاعلیٰ مودودی کی سیرت سازی میں اہم کردار ادا کیا، وہ بچپن ہی سے ذہین تھے، والد ان کو راتوں کو تاریخ اسلام اور پیغمبروں کے قصے سناتے، چھوٹی سی عمر میں وہ والد کے ہمراہ مسجد میں باقاعدگی سے نماز پڑھنے جایا کرتے۔ ایک بار مسجد میں مؤذن نہیں آیا، والد نے ابوالاعلیٰ کو اذان دینے کے لئے کہا، اس چھوٹے سے بچے ابوالاعلیٰ نے اعتماد کے ساتھ بلند آواز میں اذان دی، بچپن میں وہ گھر میں رسالے اور اخبار پڑھا کرتے تھے۔ مسدس حالی انھوں نے اپنے والد سے سبقاً سبقاً پڑھی اور اس طرح کم عمری ہی میں ان کو مسلمانوں کے عروج و زوال کا علم ہوا۔

اورنگ آباد کے مدرسہ فوقانیہ میں ابوالاعلیٰ مودودی نے ابتدائی تعلیم حاصل کی، جہاں وہ پہلی بار جدید علوم سے آشنا ہوئے، وہ بہت پڑھا کرتے تھے، کبھی کبھی فٹ بال اور کرکٹ بھی کھیلتے تھے۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ سید ابوالاعلیٰ کے حصول علم کے شوق میں اضافہ ہوتا گیا، انھوں نے اپنے مطالعے کو وسیع کیا۔ اردو، عربی اور فارسی پر عبور حاصل کرنے کے بعد انگریزی بھی سیکھی اور اس طرح ان پر جدید علوم و فنون کے دروازے کھل گئے، کم عمری میں ہی وہ والد کی شفقت سے محروم ہو گئے اور ان پر خاندان کی کفالت کا بوجھ آن پڑا جس کو انھوں نے خود اعتمادی کے ساتھ برداشت کیا، لیکن مطالعے کو برابر جاری رکھا، سب سے پہلے وہ جبل پور کے اخبار "تاج" کے ایڈیٹر ہو گئے، کچھ دن کے بعد اس سے علیحدہ ہو گئے، اس کے بعد وہ بھوپال اور پھر دہلی چلے گئے، اور انگریزی زبان میں تاریخ، فلسفہ، سیاسیات، معاشیات اور عمرانیات کا مطالعہ کیا، یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام کے خلاف بے شمار فکری اور تہذیبی حملے شروع ہوئے تھے، خلافت کی تحریک ناکام ہو چکی تھی اور مسلمان بزدلی کا شکار تھے، عام مسلمان طبقہ

مستقبل کے بارے میں متزلزل ہونے لگے۔ اس زمانے میں سید مودودیؒ نے محسوس کیا کہ فکری میدان میں بھرپور کام کیا جائے اور پھر جب کچھ افراد اس مقصد کے لئے تیار ہو جائیں تو اجتماعی جدوجہد کی جائے۔ سید مودودیؒ شاہ ولی اللہؒ اور علامہ اقبالؒ کے افکار سے متاثر تھے۔ انہی دنوں سید مودودیؒ اخبار "الجمعیۃ" سے وابستہ ہو گئے اور انھوں نے اس اخبار میں ایک اداریہ لکھا، جس کا عنوان "مسلمانوں کی راہ عمل" تھا جس میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ مسلمانوں کو متحدہ قومیت اور آزادی کے نام پر اپنی انفرادیت اور تشخص قربان نہیں کرنا چاہئے، ہم اول مسلمان ہیں اور آخر مسلمان ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں وہ اخبار الجمعیۃ سے علیحدہ ہو گئے۔

شروع شروع میں مولانا مودودیؒ، مولانا شبلیؒ اور مولانا آزادؒ کے طرز نگارش سے متاثر رہے، لیکن بعد میں انھوں نے اپنا الگ اسلوب پیدا کیا۔ یہ اسلوب ان کی تحریروں اور تقریروں میں نمایاں تھا۔ مولانا مودودیؒ نے تقریباً ۶۵ کتابیں تصنیف کیں، ان میں تفہیم القرآن کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی جو ان کی تیس برس کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار مضامین اور رسالے لکھے، ان کی کتابوں کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے، مولانا مودودی اس بارے میں کہتے ہیں۔

"ملک کے باہر تمام تر انحصار اس پر تھا کہ میری کتابوں کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ہو، سب سے زیادہ عربی زبان میں میری کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں، اس کے بعد فارسی، ترکی اور انگریزی میں ہوئے ہیں، باقی دوسری زبانوں میں ایک ایک دو دو کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں، مثلاً فرنچ میں ایک کتاب کا ترجمہ ہوا ہے، جرمن میں بھی ایک کا ہوا ہے، انڈونیشی میں بھی ہوا ہے۔ اسی طرح مختلف کتابوں کے ترجمے جاپانی میں ہوئے۔ لیکن زیادہ تر میری کتابیں پہنچی ہیں وہ اس طرح کہ عربی لٹریچر ہو جاتا تھا، اس سے پھر لوگوں نے ترکی اور فارسی میں ترجمے کئے اور جو انگریزی لٹریچر تھا اس سے پھر دوسری یورپی زبانوں میں ترجمے ہوئے"

سید مودودی نے تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی بھرپور حصہ لیا، وہ دن رات کام کرتے رہے انھوں نے صحت کی پرواہ نہ کی، وہ رات بھر لکھتے رہتے اور پڑھتے رہتے۔ ہمارے نمائندے کو ایک انٹرویو میں مولانا مودودی نے بتایا۔

"میں سوچتا ہوں کہ میں نے یہ کام کیسے کیا تو اب میری خود سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے کیسے کر لیا، پہلے پہلے ایک طرف تو مجھے علمی کام کرنا پڑا، دوسری طرف جماعت کی تنظیم کا کام بھی کرنا پڑا، تیسری طرف اس تحریک کو چلانے کے لئے دورے بھی کرنے پڑے۔ اس کے علاوہ کارکنوں کی تربیت کا کام بھی مجھے کرنا پڑا، دنیا بھر سے مختلف قسم کے جو خطوط آتے تھے، اس زمانے میں ان کے جوابات بھی میں ہی دیتا تھا، بلکہ ایک وقت ابتداء میں تو یہ حالت تھی، ایسا تھا کہ اس کے حساب کتاب بھی سارے میں ہی لکھتا تھا"

س :- منی آرڈر بھی آپ خود ہی وصول کرتے تھے؟

ج :- منی آرڈر بھی میں خود وصول کرتا تھا، یہ سب کام میں کیسے کر سکا، میں نہیں جانتا، لیکن اب جو میری صحت کا حال ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں نے اپنے جسم کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے اور اب میری ایک ایک ہڈی اور ایک ایک بوٹی مجھ سے اس کا حساب پوچھ رہی ہے کہ تم نے ہم سے اتنا سخت کام کیوں لیا۔ مشہور کتابیں ایسی ہیں جو میں نے اس طرح سے لکھی ہیں کہ رات کو میں عشاء کی نماز کے بعد بیٹھتا تھا اور صبح کی نماز کے وقت اٹھتا تھا۔ پوری پوری رات کام کرتا تھا۔ ایک وقت تھا، طاقت تھی جس میں کام کر گیا لیکن اب!

س :- مولانا! کبھی آپ نے حساب لگایا کہ آپ نے کتنا لکھا ہے؟

ج :- میں لکھتا گیا ہوں اور کبھی حساب نہیں لگایا کہ کتنا لکھا۔

س :- اب آپ نے فرمایا تھا کہ صحت آپ کی اس جدوجہد کے بعد اس سطح پر پہنچ گئی ہے کہ جسم کا ایک ایک عضو آپ سے جواب طلب کرتا ہے اب آپ کس طرح یعنی اپنی جو زندگی صحت کے اس عالم میں گزار رہے ہیں اس میں اور پہلی میں جو ایک دم سے فرق آیا ہوگا اس کو کس طرح ایڈجسٹ کرتے ہیں۔

ج :- مجھ کو اصل میں اللہ تعالیٰ نے ایڈجسٹ کر دیا ہے
یعنی مجھے کوئی بیماری اللہ نے ایسی نہیں دی کہ جس میں میں اللہ کا کام
نہ کر سکوں، ایسی بیماریاں دیں جو مجھے تکلیف دینے والی ہیں، مثلاً
اب یہ کہ میں بیٹھ کر لکھتا ہوں، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی، کھڑا ہوں
چلوں تو قدم قدم پر مجھے تکلیف ہوتی ہے، میرے لئے دس منٹ
چلنا مشکل ہوتا ہے، ڈیڑھ منٹ سے زیادہ میں کھڑا نہیں رہ
سکتا، لیکن میں بیٹھ کر لکھتا ہوں، اب بھی لکھتا ہوں لیکن تھکن مجھے
کم لاحق ہوتی ہے۔

س :- آج کل مولانا! آپ کیا لکھ رہے ہیں۔

ج :- آج کل میں سیرت پاک لکھ رہا ہوں۔

س :- یہ ابھی تفہیم القرآن کی تکمیل کے بعد؟

ج :- یعنی تفہیم القرآن کی تکمیل کی اول تو مجھے توقع نہیں
تھی کہ اس کے بعد میں نے باقی آخری حصہ لکھا ہے اور میں
یہ محسوس کر رہا تھا کہ شاید میں اسے مکمل نہ کر سکوں، لیکن خدا
نے اتنی طاقت دی کہ اس کو میں نے مکمل کر لیا، اس کے بعد میں نے
محسوس کیا کہ دوسری چیز جو ہے وہ لازماً سیرت پاک ہے،
جس کا اس سے گہرا تعلق ہے اور ان دونوں کو ملا کر اگر لوگ پڑھیں گے
تو انشاء اللہ اور بھی زیادہ مفید ہوگا۔

س :- یہ کس حد تک ہے؟

ج :- میں مکی دور مکمل کر چکا ہوں اور آج کل مدنی دور مکمل
کرنے کے لئے مواد فراہم کر رہا ہوں۔"

مولانا مودودی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اسلامی
تعلیمات کو اس طرح پیش کیا جو نئی نسل کو مطمئن کر سکے، اس لئے نوجوان
ان کے افکار اور بیان سے بہت متاثر ہوئے، اس بارے میں مولانا
مودودی نے ہمارے نمائندے کو بتایا:-

"چونکہ مسلمان طالب علم اندر سے، اس کے اندر ایک اسلام
اترا ہوا ہوتا ہے، جو ماں کے دودھ کے ساتھ ہی آتا ہے، جب وہ
کالجوں میں، اسکولوں میں آتا ہے تو اس کے سامنے بالکل ایک
دوسری چیز آتی ہے، جو اس کو اسلام سے دور ہٹانے والی ہوتی ہے
مگر اس کے اندر کا ضمیر یہ نہیں چاہتا، اسلام سے دور جانا۔ اگر کوئی اسے
مل جاتا ہے جو اسلام کو معقول طریقے سے اسے سمجھا دے تو پھر وہ پورے
اطمینان سے مسلمان رہتا ہے اور ہر اس چیز کا وہ رد کرنے کے قابل ہوتا
ہے جو اس کو اسلام سے پھیرنے والی ہو، یہی چیز ہے جس نے طلبہ میں
کنفیڈنس پیدا کیا ہے اور کوئی چیز میں نہیں سمجھتا کہ اس کی مجبوری کا ہو
اس کا بنیادی طور پر گویا دل میں مسلمان ہونا اور ان کا یہ خواہش رکھنا کہ
ہم مسلمان رہیں، جب وہاں کو مسلمان رہنے کے لئے ایک سہارا مل جاتا ہے
معقول دلیل سے اور ان تمام چیزوں کو رد کرنے کے وہ قابل ہو جاتا ہے
جو ان کو اسلام سے پھیرنے کے لئے اس جدید تعلیم میں لائی جاتی ہیں تو پھر
وہ پورا مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہ اطمینان ہی ان کو ہمارے ساتھ وابستہ

خدا کے سوا کسی کو انسانوں کے لئے قانون بنانے کا حق نہیں

کرتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہم نے ان کی ایک قابل قدر خدمت
انجام دی ہے، مولانا مودودی نے قرآن پاک کے پیغام کو پھیلانے
کے لئے رسالہ "ترجمان القرآن" جاری کیا جو تقریباً نصف صدی سے
اسلامی تعلیمات کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہے، مولانا مودودی
کی تحریروں میں مسلمانوں کے لئے دھڑکتا ہوا دل اور اشکبار آنکھیں
نظر آتی ہیں، سید ابو الاعلیٰ مودودی کی علمی بصیرت اور دینی خدمات
کی شہرت تمام عالم اسلام میں ہے، یہی وجہ ہے کہ گزشتہ سال مولانا
مودودی کو اسلام کی بے لوث خدمات انجام دینے کے سلسلے میں فیصل
ایوارڈ دیا گیا، اس ایوارڈ کے ساتھ چھ لاکھ روپے کی رقم پیش کی گئی
جو سید مودودی نے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کراچی کو عطا کی، انہی دنوں
مولانا مودودی نے ہمارے نمائندے کو پاکستان میں اسلامی شریعت
کے نفاذ کے بارے میں ایک انٹرویو ریکارڈ کرایا۔

بنیادی طور پر جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی وہ
یہ تھی کہ اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نہیں ہے، زمین خدا
کی ہے، ہوا اور پانی اور روشنی جس پر ہم زندگی بسر کرتے ہیں سب
خدا کا ہے، یہ جسم جو ہمیں حاصل ہے اور اس کی جو طاقتیں ہیں اور اس کے
جو اعضا ہیں سب کچھ خدا کے بخشے ہوئے ہیں، دنیا پر حق پہنچتا ہی کیا

کہ ہم خود اقتدارِ اعلیٰ کا دعویٰ کریں یا کسی ایسے شخص کا دعوے قبول کریں جو اقتدارِ اعلیٰ کا داعی ہو۔

تو حضورؐ نے پہلی بات جو انسان کے ذہن نشین کی اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دی، وہ یہ تھی کہ ملک بھی اللہ تعالیٰ کا ہے اور حکم بھی اللہ تعالیٰ کا ہے، اور کسی کو انسانوں کے لئے قانون بنانے کا حق نہیں ہے۔

دوسری بات جو اسی طرح سے بنیادی اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ حضورؐ نے یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو براہِ راست قانون نہیں دیتا، بلکہ اپنے رسول کے ذریعہ دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے منتخب کئے ہوئے حکمران نہیں تھے، نہ خود بنے ہوئے حکمران تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مقرر کیا تھا کہ وہ لوگوں کو تعلیم بھی دیں، لوگوں کی تربیت بھی کریں، ان کے ذہن اور اخلاق ٹھیک کریں اور اللہ تعالےٰ کے احکام پہنچائیں اور جو لوگ ان احکام کو قبول کریں اور ان پر ایمان لائیں ان کے اوپر ان احکام کو نافذ فرمائیں۔

تیسری اہم چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالےٰ کی طرف سے انسانوں کو پہنچائی اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دی، وہ آخرت کا تصور ہے۔ اگر انسان اپنے آپ کو اللہ تعالےٰ کے سامنے جواب دہ نہ سمجھے، مر کر اپنے خدا کے سامنے جانا ہے اور اپنے تمام اعمال کا جواب دینا ہے، تو وہ نہ اسلام کے راستے پر چل سکتا ہے، نہ حقیقت میں صحیح انسان بن سکتا ہے۔

ان تین چیزوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے تیرہ سال مکہ میں دعوت و تبلیغ کے ذریعے لوگوں کے سامنے پیش کیا اور جن لوگوں نے ان چیزوں کو مان لیا ان کی آپ نے جماعت بنائی۔

اسی طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ قیام مکہ کے آخری تین سال ایسے تھے جن میں مدینہ طیبہ کے باشندوں کی ایک چھوٹی سی جماعت ایمان لے آئی اور اس نے حضورؐ کی اس دعوت کو قبول کیا اور آپ کو دعوت دی کہ آپ مدینہ طیبہ تشریف لائیں۔ حضرت عائشہؓ نے بہت صحیح بات کہی ہے کہ مدینے کو قرآن نے فتح کیا ہے، یعنی کوئی تلوار نہیں تھی، کوئی طاقت نہیں تھی جس سے مدینے کے لوگ تابع فرمان بنے ہوں، بلکہ قرآن مجید جب ان کو پہنچا اور قرآن مجید کی جو مکہ معظمہ میں سورتیں نازل ہوئی تھیں، وہ ان کو بتائی گئیں، ان کو سنائی گئیں، انھوں نے ان کو حفظ کیا، یاد کیا، اس چیز کی وجہ سے وہ بالکل سچے دل سے نہ صرف یہ کہ ایمان لائے، نہ صرف یہ کہ انھوں نے اپنے چھوٹے سے دیہات میں حضورؐ کو آنے کی دعوت دی، بلکہ یہ دعوت اس بات کی تھی کہ آپ ہی ہمارے حکمران ہیں، آپ ہی ہمارے سردار ہیں، آپ ہی ہمارے فرماں روا ہیں، یعنی آپ مہاجر کی حیثیت سے، یا پناہ گزین کی حیثیت سے وہاں نہیں جا رہے تھے، بلکہ وہاں کے لوگوں نے آپ کو اپنے فرماں روا کی حیثیت سے، اپنے آقا و مولیٰ کی حیثیت سے اور اپنے معلم و مربی کی حیثیت سے دعوت دی تھی کہ آپ آیئے اور ہمیں بتایئے اس دین پر کام کرنے کے لئے جس کو آپ نے پیش کیا ہے اور جس پر ہم ایمان لائے ہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ پہنچ گئے تو پہلے دن کو آپ وہاں کے حکمران تھے، ان تمام اہلِ ایمان کے حکمران تھے جو ہجرت کر کے مکے سے گئے تھے اور جنھوں نے مدینے میں اسلام قبول کیا تھا۔ مدینے کی آبادی میں اس وقت یہودی بھی موجود تھے اور ان کی مجموعی تعداد مسلمانوں کی تعداد سے زیادہ تھی، لیکن چونکہ یہ لوگ سچے دل سے ایمان لائے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انھوں نے اپنے فرماں روا کی حیثیت سے تسلیم کیا تھا اور آپ کے احکام پر عمل کرنے کا یقین اور عہد کیا تھا، اس وجہ سے جس روز آپ مدینہ طیبہ پہنچے، اسی روز حکومت اسلامی کی بنیاد پڑ گئی۔

اس حکومت اسلامی میں جو اہم ترین چیز تھی، وہ یہ کہ سب سے پہلے لوگوں میں اسلام کا علم پھیلایا جائے، کیونکہ اسلام جہالت کا نام نہیں ہے، اسلام علم کا نام ہے، تو آپ نے اپنی پوری طاقت صرف کی اس بات پر کہ لوگ دین کو سمجھیں اور سمجھ کر ایمان لائیں، جس جس طرح سے لوگوں تک یہ چیز پہنچی اور لوگوں نے اس کو مانا، اسی طرح رفتہ رفتہ اسلام کی طاقت

بنا شروع ہوگئی، دوسرا عظیم کام جو آپ نے شروع کیا، وہ یہ تھا کہ لوگوں کے اخلاق درست کئے جائیں اور ایک ایسا اسلامی معاشرہ پیدا کیا جائے، جس کی ہر چیز اخلاق صالحہ پر مبنی ہو، کوئی نظام حکومت اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا بھی قائم کر دیجئے، اگر عام لوگوں کے اندر وہ اخلاق موجود نہیں ہیں جو اس نظام حکومت کی پشت پناہی کریں تو وہ کبھی کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا، اس وجہ سے آپ نے دوسرا اہم ترین کام جو کیا، وہ یہ کہ لوگوں کے اخلاق بنائے جائیں ایک نظام حکومت میں اگر لوگوں کے اخلاق ٹھیک اس نظام کے مزاج کے مطابق ہوں، تو وہاں قوت استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی، وہاں لوگوں کے اوپر جبر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، وہاں لوگوں کو دبانے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ صرف یہ بات کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ فلاں چیز کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور اس کے بعد لوگ فوراً خود بخود تعمیل کرتے ہیں، تعمیل کرانے کے لئے وہاں کسی پولیس کی ضرورت نہیں ہوتی، رسول اللہ صلعم کے زمانے میں کوئی پولیس نہیں تھی، اگر کبھی کسی مجرم کو قید کرنے کی ضرورت ہوتی تو کسی مکان میں بند کر دیا جاتا، جیل وغیرہ کوئی چیز نہیں تھی، بس یہ بات کہ یہ حکم خدا کی طرف سے ہے اس کے لئے کافی تھا کہ لوگ اس کو مان لیں، شراب کی مثال موجود ہے، حضور نے یہ اطلاع دی لوگوں کو کہ شراب اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہے اور اسی وقت تمام مٹکے توڑ کر شراب بہا دی گئی جو مدینے کی گلیوں میں بہتی رہی اور جس کا ہاتھ جس جگہ تھا رک گیا اس طرح کی پابندیٔ قانون کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔"

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں، لیکن وہ اپنے افکار کی روشنی میں، اپنی تحریروں کے پردے میں، اپنی تقریروں کے آئینے میں زندہ رہیں گے انسان کا جسد خاکی خاک میں مل جاتا ہے، لیکن اس کے عظیم کارنامے زندہ رہتے ہیں۔

ملت اسلامیہ ایک ممتاز عالم اور ممتاز مفکر اسلام سے محروم ہوگئی

علامہ خمینی:-

ایران کے قائد انقلاب اسلامی آیت اللہ روح اللہ خمینی نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ مولانا مودودی کی وفات سے ملت اسلامیہ ایک ممتاز عالم اور ممتاز مفکر اسلام سے محروم ہوگئی ہے، آیت اللہ خمینی نے کہا ہے کہ مولانا مودودی نے اسلامی نصب العین اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، انھوں نے کہا کہ مولانا مودودی نے شہنشاہ کے خلاف ایرانی مسلمانوں کی تاریخی جد و جہد میں مسلمانان پاکستان اور جماعت اسلامی پاکستان کی طرف سے مکمل تعاون اور حمایت کی۔

امیر جماعت اسلامی ہند:-

امیر جماعت اسلامی ہند مولانا محمد یوسف نے مولانا مودودی کی وفات پر اپنے برقی پیغام میں مولانا نے محترم کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا ہے، انھوں نے دنیا بھر میں مولانا مودودی کی مخلصانہ اور عظیم الشان خدمات کا ذکر کیا، انھوں نے کہا کہ دنیا بھر کے مسلمان مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شاندار خدمات کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

وزیر اعظم ایران:-

ایرانی وزیر اعظم جناب مہدی بازرگان نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے انتقال کے سانحۂ عظیم پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے، اسلام آباد میں ایرانی سفارت خانہ کے جاری کردہ پریس ریلیز کے مطابق جناب بازرگان نے امیر جماعت اسلامی پاکستان میاں طفیل محمد کے نام اپنے تعزیتی پیغام میں کہا ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے سانحۂ ارتحال اور اس کے نتیجہ میں پہنچنے والے ناقابل تلافی نقصان پر مجھے اور تمام ایرانی مسلمان بھائیوں کو گہرا صدمہ ہے، میں آپ سے اور پاکستان کے تمام مسلمان بھائیوں سے دلی تعزیت کرتا ہوں۔

آنسوؤں سے استقبال
آنسوؤں سے خدا حافظ!

۲۲ ستمبر کی شب حسبِ معمول ٹیلی ویژن پر خبریں سن رہا تھا، میرے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ ابھی چند لمحوں بعد مجھے ایک خبرِ وحشت اثر سننا پڑے گی۔ ۹ بجکر ۲۰ منٹ ہوئے ہوں گے کہ نیوز ریڈر نے معمول کی خبریں روک کر یہ جانکاہ خبر سنائی ــ "ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ......" اتنا سنتے ہی میں اپنی جگہ سُن ہو گیا اور اس سے زیادہ کچھ نہ سن سکا، نہیں معلوم یہ کیفیت کتنی دیر برقرار رہی، لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکلا، رکشے والے کو آواز دی اور اسے منصورہ چلنے کے لئے کہا، رکشا کوئی دو تین میل کا فاصلہ طے کر چکا ہوگا کہ میں نے اسے روک لیا اور کہا "بھائی اچھرہ جانا ہے" رکشے والے نے قدرے درشت لہجے میں کہا "بابو جی! ہوش ٹھکانے ہیں؟ آپ تو ....." میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "ہاں بھائی تم ٹھیک کہہ رہے ہو، مگر مجھے اچھرہ ہی جانا ہے"

رکشے میں بیٹھا دل میں دعائیں مانگتا جا رہا تھا، الٰہی یہ خبر غلط ہو۔ اچھرہ موڑ پر رکشا سے اترا اور بوجھل قدموں کے ساتھ ذیلدار پارک والی گلی میں مڑ گیا، میں نے دیکھا کہ لوگوں کا ایک ریلا ہے جو ذیلدار پارک کی طرف بہا جا رہا ہے

کوٹھی کے مغربی دروازے سے داخل ہوا تو صحن اور لان میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، دبی دبی سسکیوں اور گھٹی گھٹی چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ خبر غلط ہونے کی میری دعائیں مستجاب نہ ہوئی تھیں۔

اس سوگوار منظر کی منظر کشی الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ ایک جانب ایک نوجوان صدمے کے باعث بے ہوش پڑا تھا اور کچھ لوگ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے، دوسری جانب ذرا پرے مولانا کے ایک خادم شدتِ غم کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش تھے، جماعت اسلامی کے مرکز کا ایک ادھیڑ عمر ملازم دیوانہ وار لوگوں سے گلے مل مل کر روتا جاتا تھا اور کہے جا رہا تھا "بابا ٹر گیا ماڑے جن میرے سر تے کون ہاتھ رکھسی" ایک سفید ریش بزرگ بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رو رہے تھے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے نوجوان اشک بار آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ جاتے تھے مکتبہ میں بے قرار مولانا کی تصانیف کو سینے سے لگا کر قرار کی تلاش میں دیکھے گئے، کوئی پرنم آنکھوں کے ساتھ کلمۂ شہادت کے ورد میں مشغول تھا، کچھ اشک بار آنکھیں تلاوتِ کلام پاک میں مصروف تھیں، ان سوگواروں میں بوڑھے بھی تھے، جوان

بھی، عالم بھی تھے، حاجی بھی، غیر ممالک کے طلبہ بھی تھے اور نونہالان وطن بھی۔

آہ! یہ وہی ۵۔اے ذیلدار پارک ہے جہاں سے علم کے نور کی کرنیں پھوٹا کرتی تھیں اور چار دانگ عالم منور ہو جاتے۔ آج اس سرچشمۂ علم کا چراغ گل ہو چکا ہے، آج اس کے در و دیوار پر "کل من علیہا فان"، کی تفسیر رقم ہے۔

میاں طفیل محمد سوگواروں کے درمیان تصویر غم بنے بیٹھے تھے، جب چودھری ظہور الٰہی پرسا دینے پہنچے تو میاں صاحب لڑکھڑاتے ہوئے کھڑے ہوئے اور ان سے گلے ملے، تعزیت کا یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہا، چودھری ظہور الٰہی کے علاوہ نوابزادہ نصر اللہ خاں، رانا ظفر اللہ خاں، علامہ احسان الٰہی ظہیر، الطاف حسن قریشی، حبیب الرحمان شامی، مصطفٰے صادق، عبد القادر حسن اور کتنے ہی اجنبی اور شناسا غمزدہ چہرے وہاں دیکھے گئے۔

مولانا کے صاحبزادے حسین فاروق حیرت انگیز صبر و استقامت کا مظاہرہ کر رہے تھے، انھیں ان کی والدہ نے فون پر صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنے کی ہدایت کی تھی، چنانچہ وہ ٹیلی فون سننے، تعزیتی وفود سے ملاقاتیں کرنے کے علاوہ سوگواروں کو صبر کی تلقین بھی کر رہے تھے، وہ مولانا مرحوم کے آخری لمحات کے بارے میں ان کے عقیدت مندوں کو معلومات بھی مہیا کر رہے تھے، انہوں نے بتایا کہ مجھے آخری اطلاع ملنے تک ابا جان کی صحت کے بارے میں کوئی مایوسی نہ تھی، جب جمعہ کی صبح کو ٹیلیفون کیا تو مجھے اطلاع دی گئی کہ ڈاکٹروں نے مایوسی ظاہر کی ہے لیکن میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوا، بتایا گیا تھا کہ مولانا کے گردے نے کام بند کر دیا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر دوبارہ کام کرنے لگا تھا، ابا جان سے رمضان المبارک میں میری ملاقات ہوئی تو وہ بہت بہتر تھے، انہوں نے مجھے اپنا کمرہ صاف ستھرا رکھنے کی ہدایت کی تھی، میں والد مرحوم کے حکم کی تعمیل میں ان کے کمرۂ مطالعہ میں رنگ و روغن شروع کرا دیا جو آج شام تک جاری رہا۔

۲۴ ستمبر

آج بھی حسین فاروق مودودی اور محمد فاروق مودودی تعزیت کے لئے آنے والوں کے غم میں شرکت کا فرض صبر کا دامن تھامے انجام دے رہے ہیں، مولانا مرحوم کی باتیں سنا رہے ہیں، حسین فاروق نے بتایا کہ ان کی ایک نہایت قریبی عزیز معمر خاتون نے ابا جان مرحوم کی وفات سے چار روز قبل تایا جان (مولانا کے برادر بزرگ مولانا ابوالخیر مودودی مرحوم) کو دیکھا کہ وہ ایک کمرے کی صفائی کرا رہے ہیں اور وہاں صفائی کے انتظامات میں مصروف ہیں، خاتون نے پوچھا "کیا کوئی معزز مہمان آنے والے ہیں"، جواباً عرض کیا "ابوالاعلٰی آنے والے ہیں"۔

جسد خاکی کی لاہور آمد کی صحیح اطلاع پانے کے لئے آج بھی ٹیلیفونوں کی کالوں کا سلسلہ دن بھر کسی توقف کے بغیر جاری رہا۔

تعزیت کے لئے آنے والا ہر شخص مولانا کی آمد کا پروگرام جاننے کے لئے بے قرار تھا، چنانچہ ایک تختۂ سیاہ پر یہ عبارت لکھ کر ڈیوڑھی دروازے پر رکھ دی گئی "مولانا مودودی کی میت پیر کو امریکہ سے روانہ ہوگی، منگل کو علی الصبح کراچی پہنچ جائے گی"۔ بزرگ صحافی اور سید مودودیؒ کے عقیدت مند میاں محمد شفیع (م ش) نے تختۂ سیاہ پر یہ عبارت پڑھی تو بلک بلک کر رونا شروع کر دیا، آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان کہا: "مولانا! ہمیں تو آپ کا انتظار تھا، یہاں آپ کی میت آنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔"

آج جب ریڈیو پاکستان پر مولانا کی زندگی اور ان کی گراں قدر خدمات سے متعلق ریڈیو پاکستان سے پروگرام نشر کیا گیا تو گھر کے بیرونی صحن اور لان میں موجود سیکڑوں سوگوار ریڈیو کے گرد جمع ہو گئے، اس دوران ایک موقع پر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے موقع پر مولانا مودودی کی ایک نشری تقریر سنائی گئی تو سامعین مولانا کی آواز سن کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے، آہیں سسکیوں میں تبدیل ہو گئیں اور بہت سوں کی رو رو کر ہچکی بندھ گئی۔

مولانا سید ابوالاعلٰی مودودی کی رہائش گاہ پر دن بھر عقیدت مندوں کا تانتا بندھا رہا، لاہور کے علاوہ دوسرے

شہروں سے آنے والے جماعت اسلامی کے کارکن اور مولانا مرحوم کے عقیدت مند جماعت در جماعت اقامت گاہ پر پہنچتے تو درد انگیز مناظر دیکھنے میں آتے، صوبہ سرحد اور آزاد کشمیر سے بھی لوگ بڑی تعداد میں اپنی خصوصی گاڑیوں میں پہنچ گئے، ابھی تک مولانا کی میت کی آمد اور تدفین کا پروگرام واضح نہیں تھا، مگر لاہور میں بیرونی شہروں سے آنے والوں کا سیل رواں جاری تھا، کثیر تعداد میں لاہور اور قرب وجوار سے خواتین بھی مولانا کی رہائش پر پہنچیں اور سیاسی زعماء اور دینی رہنما بھی اظہار تعزیت کیلئے پہنچے۔

۲۵ ستمبر

ڈاکٹر احمد فاروق نے بتایا کہ مولانا مودودی نے پاکستان سے امریکہ روانہ ہونے سے قبل کہا تھا کہ میں اپنی سالگرہ پر واپس لاہور پہنچنا چاہتا ہوں اور ۲۵ ستمبر کو مولانا کی سالگرہ کا دن تھا اسی روز مولانا کا جسد خاکی لاہور پہنچنے والا تھا، آخری اطلاع کے مطابق مولانا کا تابوت لے کر پی آئی اے کا ایک طیارہ تین بجے لاہور ایئرپورٹ پر پہنچ رہا ہے، مولانا کے عقیدت مندوں کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں، ملک کے گوشے گوشے اور عالم اسلام کے مختلف ممالک سے ہے، طیارہ کی آمد سے دو گھنٹے پہلے ایئرپورٹ پر جمع ہونے شروع ہو گئے ہیں، ان میں جماعت اسلامی پاکستان کے اکابرین کے علاوہ جماعت اسلامی آزاد کشمیر کے امیر مولانا عبدالباری، جماعت اسلامی ہند کے امیر مولانا محمد یوسف مع رفقاء، اسلامک موومنٹ آف انڈیا کا وفد، عالم عرب کی مختلف تنظیموں کے نمائندے، اردن کا تعلیمی وفد، خواجہ خیر الدین، چوہدری ظہور الٰہی، ملک محمد قاسم، سردار شوکت حیات، ریٹائرڈ جسٹس مسٹر جسٹس، افضل چیمہ، احمد سعید کرمانی، امیر حرکت اسلامی انقلاب افغانستان مولانا محمد نبی مجددی اور بہت سے دیگر زعماء شامل ہیں۔

دو بجکر ۴۵ منٹ ہو رہے ہیں، ایئرپورٹ پر ہزاروں مردوں اور عورتوں کا ہجوم، مغموم، مضطرب اور منتظر کھڑا ہے نظم وضبط برقرار رکھنے کے فرائض اسلامی جمعیت طلبہ، نیشنل لیبر فیڈریشن نے سنبھال رکھے ہیں، سیکورٹی اسٹاف بھی اپنی ڈ

کر رہا ہے، مولانا مرحوم کے آخری سفر میں ہم سفر ہونے کے خواہش مندوں کا ہجوم بے پناہ ہوا جا رہا ہے، اہم سیاسی و سماجی رہنما ہوائی اڈے پر پہنچ چکے ہیں، ۲ بجکر ۵۰ منٹ ہو گئے، سیاہ رنگ کی ایک کار میں مولانا مرحوم کے صاحبزادے حسین فاروق اور محمد فاروق بھی چند خواتین کے ہمراہ پہنچ گئے ہیں، پی آئی اے کا ایک اہلکار ہاتھ میں چند دستاویزات تھامے پہنچتا ہے اور حسین فاروق مودودی سے ان کاغذات پر دستخط حاصل کرتا ہے۔

تین بجنے کو ہیں پی آئی اے کی عام پرواز پی کے ۳۰۰ کا ایک طیارہ سوگوار فضا میں نمودار ہوا، نعرہ تکبیر اللہ اکبر سے فضا گونج اٹھی ہزاروں مرد وخواتین کو ایئرپورٹ کے باہر ہی روک دیا گیا سینکڑوں لوگ کسی نہ کسی طرح اندر گھس آئے ہیں، اضطرار، اضطراب، بے تابی کی عجب کیفیت ہے، تین بجکر دو منٹ پر طیارہ کا دروازہ کھلا، جہاں جناب سیّد کی میت ایک تابوت میں بند ہے، میاں طفیل محمد، جان محمد عباسی، پروفیسر خورشید احمد، مولانا کی اہلیہ، ان کے بیٹے ڈاکٹر احمد فاروق، بیگم احمد فاروق، مولانا کے داماد مسعود احمد ان کے ساتھ آئے ہیں، مولانا کا جسد خاکی، قاضی حسین احمد، لیاقت بلوچ، مولانا کے صاحبزادوں حسین فاروق، خالد فاروق، چوہدری ظہور الٰہی اور سیاسی و جمعیت کے کارکنوں نے طیارے سے ٹرک پر منتقل کیا، تابوت کے اوپر سبز ہلالی پرچم اور گلاب کے پھول پڑے ہیں، نظم وضبط برقرار رکھنے کی کوششیں ناکام ہو رہی ہیں، بہت سے نوجوان اور بوڑھے تابوت تک پہنچنے کے لئے والہانہ طور پر لپک رہے ہیں، ایک شخص کے ہوش وحواس قابو میں نہ رہے، وہ مولانا مرحوم کا اسی وقت دیدار کرنا چاہتا ہے بالآخر تابوت پانچ منٹ کے اندر اندر ٹرک پر پہنچا دیا گیا، مشتاقان دید ٹرک کی طرف لپکے، بہت سے نوجوان پہلے ہی ٹرک میں سوار ہو گئے ہیں، چوہدری ظہور الٰہی اور جماعت اسلامی آزاد کشمیر کے امیر مولانا عبدالباری، مولانا مرحوم کے ساتھ آخری سفر پر مصر ہیں اور ٹرک پر سوار ہو گئے ہیں۔

دو نوجوانوں نے پاکستان کا سبز ہلالی پرچم اور جماعت اسلامی کا

سبز جھنڈا جس پر کلمہ طیبہ لکھا ہے، تھام لیا، اس لمحہ فضا مزید سوگوار ہو گئی ہے، آہیں اور سسکیاں نالہ و شیون میں بدل گئیں، بزرگوں کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہیں، ٹرک کے ارد گرد کھڑے افراد کی زبان پر کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت کا ورد ہے، کئی حسرت و یاس کی تصویر بنے ہیں، جن کی زبانیں گنگ ہیں، حال دل کہنے کے لئے زبان ہی کی تو ضرورت نہیں ہوتی۔

اس دوران طیارہ کے دوسرے دروازے سے عام مسافروں کے ہمراہ بیگم مودودی، ڈاکٹر احمد فاروق مودودی، بیگم احمد فاروق، مولانا مرحوم کے داماد قاضی مسعود احمد، امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد، پروفیسر خورشید احمد، مولانا جان محمد عباسی اتر رہے ہیں، بیگم مودودی اپنے صاحبزادے ڈاکٹر احمد فاروق اور ان کی اہلیہ کے ہمراہ ایک سوگز دور کھڑی اپنی کار میں پہنچ گئی ہیں، جہاں مولانا مرحوم کی صاحبزادیاں ان کی اہلیہ محترمہ، صبر اور ضبط و تحمل کی مثال ہیں۔

ایرپورٹ کی فضا میں کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت کے ورد کے علاوہ نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کی آوازوں میں زار و قطار رونے کی آوازیں بھی شامل ہیں، مولانا کی میت والا پی آئی اے کا ٹرک جو سوگواروں کے ہجوم میں ہے، تین بجکر پانچ منٹ پر روانہ ہوا، چند منٹ مزید گذر گئے، مگر ابھی تک یہ ٹرک ایرپورٹ سے باہر نہیں آ سکا، زیادہ سے زیادہ لوگ ٹرک پر آنے کی کوشش کر رہے ہیں، بہت سے اسے چھوتے ہی کو سعادت سمجھتے ہیں، آہستہ آہستہ جب ٹرک باہر کی طرف آیا تو فضا میں مسلسل نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوتے ہیں، ڈاکٹر احمد فاروق جو اپنی والدہ کے ہمراہ کار میں بیٹھ چکے تھے، باہر نکل آئے اور بلند آواز میں نعرہ زن نوجوانوں کو منع کر رہے ہیں، نعرے مت لگائیے، میت کا یہ سفر پُر وقار انداز میں نہایت خاموشی سے ہونا چاہئے۔

۳ بجکر ۲۵ منٹ ہو رہے ہیں، میت والا ٹرک آہستہ آہستہ ایرپورٹ سے روانہ ہو رہا ہے، جونہی یہ ٹرک بڑے

دروازے سے باہر نکلا، مشتاقان دید کا سیلاب امڈ پڑا اور ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے، ایک سوگوار چلایا "آہ میری متاع حیات لٹ گئی" ایک باریش ادھیڑ کو بے ہوشی کے عالم میں مجمع میں سے باہر لایا گیا۔ اسی اثناء میں دو مزید افراد بے ہوش ہو کر گر پڑے، تین بجکر ۲۹ منٹ پر سوگوار ہوائی اڈے کی عمارت سے سڑک پر پہونچ گئے، درجنوں بسیں، سیکڑوں کاریں ہزاروں سکوٹر اور موٹر سائیکل مولانا مرحوم کی میت لے کر ان کے گھر اچھرہ کی طرف رواں ہو گئے ہیں۔

سوگواروں کا جلوس مولانا مرحوم کی میت کے ہمراہ ایرپورٹ سے شاہراہ قائد اعظم کے راستے اچھرہ جانے پر مصر تھے، چنانچہ جلوس گورنر ہاؤس، ریگل چوک، شاہراہ فاطمہ جناح اور چوک قرطبہ سے ہوتا ہوا فیروز پور روڈ پہنچا ہے، راستے میں جگہ جگہ سڑک کے دو رویہ کھڑے لاتعداد مرد اور عورتیں میت پر پھول نچھاور کر رہی ہیں، چھاؤنی کے علاقے سے گذرتے ہوئے میت کا خیر مقدم کرنے والوں میں جوانوں کی کثیر تعداد بھی موجود تھی راستے میں جا بجا بہت سے عقیدت مند فوجی انداز میں سلام کرتے ہوتے اور بہت سے بارگاہ الٰہی میں دست بدعا دیکھے گئے۔

نوجوان عقیدت مندوں کی جو جماعت نظم و ضبط برقرار رکھ رہی ہے، ان کے بازوؤں پر سبز پٹیاں بندھی ہیں، ایک بس پر لاؤڈ سپیکر نصب ہے جہاں سے بار بار کلمہ طیبہ کا ورد جاری رکھنے کی تلقین کی جا رہی ہے، کبھی کبھار نعرۂ تکبیر اور رہبر و رہنما مصطفیٰ مصطفیٰ اور المدد المدد، یا خدا یا خدا کے نعرے بھی سنائی دے رہے ہیں اس ماتمی جلوس کے شرکاء جن بسوں اور گاڑیوں میں سوار ہیں، وہ لاہور کے علاوہ ملک کے دور دراز علاقوں اور تنظیمی اداروں سے بھی آئی ہیں، جن پر ان کے مقامات کے بینر آویزاں ہیں، ایک بس مینگورہ (سوات) کی بھی جلوس میں شامل دیکھی گئی، بعض گاڑیوں پر کلمہ طیبہ اور انا للہ وانا الیہ راجعون کے بینر آویزاں ہیں۔

اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمائندے اور فوٹو گرافر جو

کی جماعتیں اپنے فرائض ادا کرنے میں مصروف ہیں، بعض سوگواروں نے اپنے طور پر بھی تصاویر اور مووی فلمیں بنانے کا اہتمام کر رکھا ہے، بعض لوگ ٹیپ ریکارڈر پر نعروں اور درود کی آوازیں ٹیپ کر رہے ہیں۔

ایئرپورٹ سے اچھرہ تک تقریباً سات میل کا راستہ دو گھنٹے چالیس منٹ میں طے ہوا، جب جلوس مزنگ چونگی پہنچا تو ایک معمر باریش شخص کلمہ طیبہ کا بلند آواز میں ورد کرتے کرتے بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ ۵ بجکر ۳۲ منٹ ہو گئے ڈاکٹر احمد فاروق، خواتین کے ہمراہ اپنی گاڑی میں اچھرہ پہنچ چکے ہیں، ۵ بجکر ۴۰ منٹ پر موٹر سائیکل سواروں کا ہراول دستہ پہنچ چکا ہے۔ مولانا مرحوم کی اقامت گاہ پر اس وقت ہزاروں خواتین جمع ہو چکی ہیں، پروگرام کے مطابق میت کا آخری دیدار کرنے کا موقع پہلے خواتین کو دیا جاتا ہے، خواتین بھاری تعداد میں مسلسل آ رہی ہیں، اس لئے اچھرہ موڑ سے آگے آنے والے مردوں کو روکا جا رہا ہے، اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکن نظم و ضبط برقرار رکھنے پر سختی سے عمل کر رہے ہیں۔

۵ بجکر ۴۵ منٹ ہو گئے، میت کا ٹرک اچھرہ موڑ سے گھر کی جانب مڑا، کلمہ شہادت اور آہ و فغاں کے غلغلے نے سوگوار فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا، میت کے ساتھ آنے والے ہر شخص کی نگاہ مرحوم کی اقامت گاہ کے باہر لگے بینر پر مولانا کے ان اقوال پر پڑ رہی ہے

"میں بندہ ہوں، بندگی کرتا ہوں جب اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی رہنمائی حاصل ہے، تو میں پھر کسی اور چیز کی طلب کیا کروں!"

"میری آخری نصیحت یہ ہے کہ وہ سب لوگ جو اس تحریک کے ساتھ ہیں، خدا کے کام کو اپنے ذاتی کاموں پر ترجیح دیں۔"

۵ بجکر ۴۸ منٹ ہو گئے، میت کا ٹرک مولانا کے گھر کے سامنے کھڑا ہے، آنکھوں سے آنسو رواں ہیں، ہر شخص میت کا تابوت خود اتارنا چاہتا ہے، بالآخر مولانا کے دوسرے صاحبزادے جماعت اور جمعیت کے کارکن ۵ بجکر ۴۹ منٹ پر تابوت اتار کر اندر لے جاتے ہیں۔ ۵ بجکر ۵۰ منٹ پر اسے مولانا مرحوم کے کمرہ مطالعہ کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔

اچھرہ موڑ پر سوگواروں کی ٹولیاں سیدی مرشدی، مودودی مودودی اور سیدی الوداع الوداع کے جگر پاش نعرے بلند کر رہی ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری ہے، مساجد سے مغرب کے وقت تکبیر کی آواز بلند ہوئی اور سوگوار یکلخت خاموش ہو گئے۔

خواتین نے میت کا آخری دیدار شروع کر دیا، بیوہ تعزیت کے لئے آنے والوں کو صبر کی تلقین کر رہی ہیں۔

تین عورتیں مولانا کی زیارت کے دوران بے ہوش ہو جاتی ہیں، اسی اثنا میں صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق، گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل سوار خان کی معیت میں ۵ - اے ذیلدار پارک پہنچتے ہیں، کچھ دیر کے بعد تو خواتین کو روک دیا گیا، صدر پاکستان کو مولانا کے نزدیک لے جایا جاتا ہے، مولانا کا جسد خاکی دیکھ کر صدر آبدیدہ ہو جاتے ہیں، صدر نے میاں طفیل محمد اور مولانا کے صاحبزادگان سے اظہار تعزیت کیا، وہ کوئی دس منٹ یہاں ٹھہرے، ساڑھے نو بجے رات مردوں کو دیدار کا اذن ملتا ہے، ان مشتاقان دید میں دور دراز کے علاقوں سے سفر کر کے آنے والے بھی شامل ہیں ان کے قیام و طعام کا انتظام اسلامی جمعیت طلبہ اور جماعت اسلامی نے کیا ہے بہت سے اپنے احباب کے ہاں قیام پذیر ہیں، مشتاقان دید میل بھر لمبی قطار میں باری باری مولانا کا آخری دیدار کر رہے ہیں، رات ڈھل چکی ہے مگر قطار کی طوالت میں کمی نہیں آئی، میت کو مولانا کے مطالعہ کے کمرے کے سامنے صحن میں رکھا گیا ہے، تلاوت کلام پاک کا تسلسل ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں ٹوٹتا، مولانا کے صاحبزادے محمد فاروق اپنے عظیم باپ کے سرہانے بیٹھے ہیں، دیدار کرنے والوں کو چلتے رہنے اور نظم و ضبط قائم رکھنے کی تلقین کر رہے ہیں، میت دیکھتے ہی عقیدت مندوں پر گریہ طاری ہو جاتا ہے، مولانا کے صاحبزادے

میت کی تصویر لینے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔ اخبارات کے فوٹو گرافر تصویر اتارنے کے لئے بے تاب ہیں، ہر ایک کی منت سماجت کر رہے ہیں۔

مولانا کا چہرہ ہمیشہ کی طرح بلکہ ہمیشہ سے زیادہ پرسکون اور پُرنور ہے، یہ سوچ کر کہ کل یہی چہرہ خاک میں پنہاں ہوگا، دل پر جو گزرتی ہے بیان نہیں کر سکتا، مگر حسن تو لازوال ہے یہ نور اور یہ حسن رخ بدل بدل کے آئے گا اور ہماری راہوں کی تاریکی تجلی رہے گی

۲۶ ستمبر

میں علی الصبح ۵۔ اے ذیلدار پارک جیسے پہنچ جاتا ہوں، مولانا مرحوم کے آخری دیدار کے لئے آنے والے عشاق کی جیسی قطار میں جس حال میں رات چھوڑ گیا تھا، اسی طرح موجود ہے، جنازہ اٹھنے اور آخری دیدار کا وقت ختم ہونے میں تھوڑی دیر باقی ہے مولانا مرحوم کے صاحبزادے غم سے نڈھال عقیدت مندوں کو صبر کی تلقین کر رہے ہیں، وہ کبھی کوٹھی کے اندر جا کر اہل خانہ اور کبھی باہر آ کر اپنے عظیم اب کے ہزاروں فرزندوں کو تسلیاں دے رہے ہیں، یہ حسین فاروق ہیں جو کئی رات سے نہیں سو سکے یہ محمد فاروق ہیں جو کھوئے کھوئے سے ہیں، یہ خالد فاروق ہیں خاموش اور اداس، مگر یہاں تو مجھے سیکڑوں نہیں ہزاروں ہزاروں نہیں لاکھوں خالد فاروق اور حسین فاروق نظر آ رہے ہیں۔

صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں، ہنوز مشتاقان دید قطار میں کھڑے ہیں کہ دیدار کا وقت ختم ہونے کا اعلان ہوا میت کو پھر سے تابوت میں بند کرنے کا کام شروع ہو گیا، آٹھ بجکر پچیس منٹ پر یہ کام بھی مکمل کر لیا گیا، پی آئی اے کا ٹرک جس میں میت ہوائی اڈے سے لائی گئی تھی، مولانا مرحوم کے بڑے دروازے پر لایا جاتا ہے۔ "سیدی مرشدی الوداع الوداع" کا ایک نعرہ لگا اور نوجوان عقیدت مند زار و قطار رونے لگے، نوجوانوں نے تابوت اٹھایا، بہت سے عقیدت مند اپنے حواس پر قابو نہیں پا رہے تھے، تابوت سے لپٹ لپٹ جاتے ہیں۔

اور قائد اعلیٰ کو آنسوؤں کے نذرانے پیش کر رہے ہیں۔

نوجوانوں نے تابوت ٹرک میں رکھ دیا ہے، لاکھوں افراد سسکتے اور بلکتے ہوئے جنازہ کے ہمراہ قذافی سٹیڈیم چل دیے میاں طفیل محمد، پروفیسر خورشید، ڈاکٹر احمد فاروق، حسین فاروق اور جماعت کے بعض دوسرے رہنما اور جمعیت کے کارکن ٹرک میں میت کے ساتھ موجود ہیں، اسلامی جمعیت کے کارکنوں نے میت ٹرک میں رکھ کر اس کے آگے قومی پرچم اور جماعت کا جھنڈا گاڑ دیا، میت سڑک تک پہنچانے کے لئے نہایت منظم اور مرتب اہتمام کیا گیا ہے۔ اس عظیم سانحہ کے غم میں نڈھال نوجوان نہایت حوصلہ مندی کے ساتھ مولانا مرحوم کے گھر کی طرف آنے والے ان گنت افراد کو روکے کھڑے ہیں، جونہی سید مودودی کا تابوت سڑک پر نمودار ہوا، سڑک پر کھڑے لوگوں کے صبر کے بند ٹوٹ گئے، رندھے ہوئے گلے کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت کا ورد کر رہے ہیں، خودی کا سر نہاں جاننے والے ایک لطل جلیل کے درجات کی بلندی کے لئے دعا گو ہیں، ہر آنکھ اشک بار ہے، ہر چہرہ افسردہ ہے۔

لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر کی صدائیں آہستہ آہستہ قذافی سٹیڈیم کی طرف بڑھ رہی ہیں، فیروز پور روڈ پر ٹریفک بند ہے، مولانا مرحوم کی اقامت گاہ سے قذافی سٹیڈیم کا چند فرلانگ کا راستہ ایک گھنٹہ ۲۰ منٹ میں طے کیا جاتا ہے، جنازہ کا جلوس اچھرہ سے قذافی سٹیڈیم تک پھیلا ہوا ہے، لگتا ہے کہ ایک شہر ہے جو قذافی سٹیڈیم کی طرف بڑھ رہا ہے۔

قذافی سٹیڈیم میں آٹھ بجے سے ہی لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں، لاؤڈ سپیکر پر بار بار مجمع سے نظم و ضبط برقرار رکھنے اور کلمہ شہادت کا ورد جاری رکھنے کی اپیل کی جا رہی ہے، جنازہ پہنچنے سے پہلے پہلے قذافی سٹیڈیم کھچا کھچ بھر گیا، لاکھوں افراد کے سمانے کی گنجائش رکھنے والے قذافی سٹیڈیم کا دامن تنگ نظر آ رہا ہے اسٹیڈیم کے اندر اور باہر عشاقان مودودی کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اور ان کی وارفتگی دیدنی ہے، ہزاروں لوگ سٹیڈیم کی سیڑھیوں پر ہی نماز جنازہ ادا کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

جنازے کے جلوس میں بہت سے عقیدت مند بے ہوش ہو ہو کر گرتے رہے۔ قذافی اسٹیڈیم میں بھی ایک نوجوان بے ہوش ہوگیا، اسے ہلال احمر کی گاڑی میں پہنچا دیا گیا، ابتدائی امداد دی گئی بعد میں سروسز ہسپتال بھجوا دیا گیا۔ رشاداں چوک کے قریب ایک شخص پر دل کا دورہ پڑا اسے بھی سروسز ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ غم سے نڈھال سوگوار متعدد مقامات پر بے ہوش ہو کر گرتے رہے۔

دس بجکر پانچ منٹ ہو گئے۔ مولانا مرحوم کی میت کا تابوت قذافی سٹیڈیم کے گیٹ نمبر ۱ سے اندر داخل ہوا۔ ہزاروں افراد نے اس کے ساتھ ہی داخل ہونے کی کوشش کی۔ بہت سے سیڑھیوں پر چڑھ کر اپنے قائد کا تابوت دیکھنے کے لئے اپنی جان سے بھی بے پروا معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ کئی زخمی ہوئے۔ تابوت اندر لا کر رکھ دیا گیا، اگلی صفوں میں قطر کے ڈائرکٹر مذہبی امور اور جامع ازہر کے سابق نائب شیخ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کے علاوہ سعودی عرب کے سفیر ریاض الخطیب، سعودی سکالر ڈاکٹر عبدالقادر جابر، سعودی کونسلر خالد سمہان، ایران کے ناظم الامور آقائے مجتبیٰ دوست، ایران کے قائم مقام قونصل جنرل محمد اردک اردی، کویت کے محمد عدنان سعید، عبدالعزیز سطوحی عبداللہ العقیل، شام کے ماہر قانون جناب سعید حوی، قطر کے ماہر تعلیم جناب عبدالقیوم، اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین جسٹس محمد افضل چیمہ، سابق چیف جسٹس سردار محمد اقبال، پاکستان قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصراللہ خاں، ایس ایم ظفر، مخدوم زادہ حسن محمود، سردار عبدالقیوم، ایئر مارشل ریٹائرڈ اصغر خاں، مسٹر پیش امام محمد حنیف رامے، لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ اعظم خاں، سردار شوکت حیات، علامہ احسان الٰہی ظہیر اور بہت سی اہم ملکی و غیر ملکی شخصیتیں موجود ہیں، دس بجکر ۱۶ منٹ ہو گئے، صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل سوار خاں اور بہت سے اعلیٰ فوجی حکام سٹیڈیم میں داخل ہوئے، نعروں کی آوازیں بلند ہوئیں، مگر صدر مملکت نے نعرہ زنی جوانوں کو اس سے منع کر دیا۔

نماز جنازہ کے لئے صفیں درست کی جا رہی ہیں، ڈاکٹر یوسف القرضاوی امامت کرا رہے ہیں، سیڑھیوں پر موجود ہزاروں افراد نے وہیں کھڑے کھڑے نیت باندھ لی ہے، نماز جنازہ کے بعد اعلان ہوا کہ ڈاکٹر احمد فاروق اور میاں طفیل محمد اہم اعلان کرنا چاہتے ہیں، مگر لاؤڈ سپیکر خراب ہوگیا آواز لوگوں تک نہ پہنچ سکی اور لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور تابوت کی جانب لپک پڑے ہیں تابوت اٹھا لیا گیا، اسی گیٹ سے باہر لے جا کر ٹرک میں رکھ دی گئی، غیر ملکی مہمان بھی اسی ٹرک میں سوار ہو گئے ہیں۔ اس دوران اسٹیڈیم کے باہر بھی ہزاروں افراد نے سٹیڈیم کے اندر گنجائش نہ ہونے کے سبب الگ نماز جنازہ ادا کر لی ہے، سوگواروں کا قافلہ مولانا مرحوم کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا، مولانا مرحوم کی میت سوا بارہ بجے اچھرہ پہنچا دی گئی ہے سیکڑوں افراد روکنے کے باوجود مرحوم کی کوٹھی میں داخل ہو گئے ہیں، جبکہ بعد میں اندر سے دروازے بند کر دئے جاتے ہیں تا کہ تدفین اطمینان کے ساتھ کی جا سکے۔

ساڑھے بارہ بج رہے ہیں، مولانا کی میت کو لان میں ایک اونچی جگہ رکھ دیا گیا ہے اور مرحوم کی آخری آرام گاہ تیار کی جا رہی ہے یہ آرام گاہ ان کی کوٹھی کے سامنے پلاٹ میں جہاں مرحوم باجماعت نماز ادا کیا کرتے تھے، مشرق کی سمت دیوار سے چند فٹ کے فاصلے پر واقع ہے، یہ قبر سات فٹ لمبی، سات فٹ گہری اور چار فٹ چوڑی ہے۔ قبر کے لئے زمین کا سینہ چاک کیا جاتا ہے تو وہاں موجود سوگواروں کے جگر شق ہو جاتے ہیں، اس دوران سید مودودی کے بڑے بیٹے عمر فاروق کے دو کمسن بیٹے باہر آئے، ان میں سے ایک نے کہا   سے کہا: "ادھر نہ جانا، وہاں دادا آرام کر رہے ہیں"، دوسرے نے کہا، "اتنے لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہیں کیا اس سے دادا بے آرام نہیں ہوتے"۔ اس بچے نے کچھ توقف کے بعد پھر کہا "اتنے لوگ یہاں ہر روز آتے رہے تو دادا اپنا کام کس طرح کریں گے؟"۔ لوگ معصوم بچوں کی گفتگو سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، دو بجے یہاں پھر نماز جنازہ ادا کی جاتی ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ دھڑکتے دل لرزتے ہاتھوں
بے تاب جذبوں اور روتی آنکھوں نے تحریر کی

اکابرین جماعت نے روتے ہوئے کہا
اس صدی کا رجل عظیم اٹھ گیا

ماہ شوال کا آغاز جتنا ہی زیادہ پرمسرت اور خوشکن تھا اسکا اختتام اتنا ہی زیادہ بلکہ اس سے بڑھ کر دردناک اور افسوس ناک تھا۔ اس ماہ کی ابتدا عید کے چاند سے ہوتی ہے تو اس کی انتہا عالم اسلام کے سورج کے غروب پر ہوتی ہے۔

۲۳ ستمبر کو صبح جیسے ہی جامعہ میں داخل ہوا طلبہ عزیز نے بتایا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ یہ سنتا تھا کہ مجھ پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کسی طرح انجمن طلبہ قدیم کے دفتر پہنچا تو دیکھا کہ ہمارے تمام ساتھی ریڈیو کے ارد گرد حلقہ بنائے غمگین بیٹھے آنکھوں سے آنسو بہا رہے تھے۔ دفتر سے باہر نکلا تو ہر طرف سناٹا تھا جامعہ کے در و دیوار سے رنج و غم ٹپک رہا تھا کچھ دیر بعد طلبہ و اساتذہ کا اجتماعی طور پر تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں افسردہ دلوں اور اشکبار آنکھوں نے مودودی صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔

ریڈیو کے ذریعہ معلوم ہوا کہ نماز جنازہ جمعرات کو ہوگی، کچھ لوگ جنازہ میں شرکت کے لیے پاکستان جا رہے ہیں۔ تو میں بھی استاذ محترم مولانا عبدالمجیب [illegible] کے ساتھ پاکستان کے لیے روانہ ہو گیا

دہلی مرکز جماعت پہنچے تو وہاں بھی عجیب عالم تھا۔ سب کے دل غم زدہ تمام چہرے افسردہ، سبھی سوگوار تھے۔ پاکستانی سفارت خانہ پہنچ کر ویزا حاصل کیا گیا، سفارت خانے میں ظہر کی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا تو دیکھا کہ اس وقت پورا سفارت خانہ بند کر دیا گیا ہے اور تمام لوگ نماز باجماعت ادا کر رہے ہیں، یہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ خدا کے فضل و کرم سے بڑی آسانی سے ویزا مل گیا اور ہم لوگ پاکستان کے لئے روانہ ہو گئے، اس موقع پر ہمارا ہند و پاک کی دونوں حکومتوں سے واسطہ پڑا، دونوں ہی حکومتوں نے بڑی فراخدلی سے کام لیا اور ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں، اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مولانا مرحوم ہی کی وہ ذات ہے جس نے بیس سال سارے حدود و قیود کو توڑ دیا اور اللہ تعالیٰ نے مرحوم کے طفیل اتنی آسانیاں فراہم کیں، اس پر ہم جتنا بھی اللہ کا شکر ادا کریں کم ہے۔ اس نے اپنے فضل خاص سے ہمیں تمام سہولتیں عطا کیں۔

خدا خدا کر کے پاکستان پہنچے، چونکہ جنازہ جمعرات کے بجائے بدھ ہی کو ہو گیا اس لئے شریک نہ ہو سکے جس کا افسوس یقیناً زندگی بھر رہے گا، بہرحال مولانا کی ابدی قیام گاہ پر پہنچے دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے فاتحہ پڑھی وہاں پر ایک ہجوم تھا لیکن بالکل ہی سناٹا۔ مولانا طفیل محمد صاحب اور مولانا کے بڑے صاحبزادے عمر فاروق صاحب کو گھیرے ہوئے تھے سب کے چہرے افسردہ تھے، آنکھیں نمناک تھیں، ہر طرف ماتم ہی ماتم تھا۔

مولانا طفیل محمد صاحب سے باتیں ہوتی رہیں، مغرب کا وقت ہو گیا اور اس پارک میں جہاں مولانا مرحوم ٹہلا کرتے تھے اور جس میں عصر بعد درس قرآن اور درس حدیث کا پروگرام رہتا تھا، نماز مغرب ادا کی گئی اور سبھی لوگ عشاء تک منصورہ مرکز جماعت پہنچ گئے جہاں باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کے اعزاز میں عشائیہ کا پروگرام تھا۔

پاکستان میں کل چھ روز رہنے کی سعادت نصیب ہوئی روزانہ مرحوم کی قبر پہ حاضری رہتی، مرحوم کے دیرینہ رفقاء کار سے ملاقاتیں کرتا اور ان کی زبانی مولانا کی کہانی سنتا، ملاقات کے وقت میں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ حضرات جنہوں نے اپنی پوری زندگی مولانا کی صحبت میں گذاری، ازراہ کرم میرے لئے چند جملے تحریر فرما دیں، چنانچہ باوجود اس کے کہ لوگ غم سے نڈھال تھے، ذہن پریشان تھا اور دل غمگین تھا، مگر انھوں نے چند جملے میری ڈائری میں تحریر فرمایا۔ میری یہ خواہش ہے کہ میں ان قیمتی جملوں کو قارئین کے سامنے پیش کروں، تاکہ وہ بھی میری طرح ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ چونکہ میرا تعلق جامعۃ الفلاح سے تھا، اس لئے ڈائری میں کچھ وہ قیمتی جملے بھی درج ہوئے ہیں جس کو مولانا مرحوم نے جامعہ سے متعلق فرمایا تھا۔ میں سب سے پہلے مولانا خلیل حامدی کی تحریر کردہ عبارت کو پیش کر رہا ہوں یہی وہ شخص ہیں جن کو مولانا مودودی نے فیصل ایوارڈ لینے کیلئے سعودی عرب بھیجا تھا۔

مولانا خلیل حامدی :-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعۃ الفلاح نے اسلامی علوم کی اشاعت اور دعوت اسلامی کے فروغ کے لئے جو کوششیں سرانجام دی ہیں اور اب تک سرانجام دی جا رہی ہیں، وہ اگر کسی مسلمان ملک میں ہوتیں تو شاید دوامی ستائش ہی کافی ہوتی، مگر یہ اسلامی خدمات ہندوستان کی سرزمین میں انجام دی جا رہی ہیں، جہاں معاشرتی ماحول اور سیاسی دباؤ اور اقتصادی تقاضے قدم قدم پر اسلام کے راستے میں مزاحم ہوتے ہیں، اس بنا پر جامعۃ الفلاح سے وابستگی رکھنے والے حضرات پوری اسلامی دنیا کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں اور ہندوستان کے مستقبل میں ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں جب کوئی منصف مؤرخ قلم اٹھائیگا تو وہ صحیح معنوں میں اس عظیم ادارے اور اس کے مخلص فرزندوں کا حقیقی مقام بیان کرے گا۔

میں یہاں بیٹھا ہوا اس ادارے کو احباب کو مخلصانہ سلام اور قلبی دعائیں ہی پیش کر سکتا ہوں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ "جامعۃ الفلاح کے مؤذن نے "حی علی الفلاح" کی آواز اس زور سے لگادی ہے کہ نمازیوں کی کثرت سے شاید جامعہ کو تنگ دامنی کی شکایت کرنی پڑے"۔

خلیل احمد الحامدی

۱۰/اکتوبر ۱۹۷۹ء

مولانا نعیم صدیقی

یہ تحریر جناب مولانا نعیم صدیقی صاحب کی ہے، جو مولانا کے دیرینہ رفیق کار، محسن انسانیت کے مصنف اور بہت بڑے اسلامی شاعر و ادیب ہیں، موصوف کو مولانا کے انتقال سے کافی صدمہ پہنچا ہے۔

"مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ [illegible]

کی تعمیر تھی، پس مولانا کا اور ان کے ساتھ میرا پیغام بھی یہ ہے کہ جس مبارک و مقدس کام میں انھوں نے قوت کی ہر رتی خرچ کردی، ہم میں سے ہر فرد اسی کام میں اپنا سب کچھ لگا دے۔"

نعیم صدیقی
یکم اکتوبر ۱۹۷۹ء

مولانا سید اسعد گیلانی

یہ تحریر مولانا سید اسعد گیلانی صاحب کی ہے جو مولانا مرحوم کے پرانے ساتھی اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، اس وقت لاہور کے امیر جماعت ہیں، موصوف نے اسلامی اکاڈمی قائم کی ہے، حال ہی میں موصوف کی تازہ تصنیف "مولانا مودودی کا بچپن، جوانی بڑھاپا" شائع ہوئی ہے۔

"مولانا مودودی اس صدی میں اسلام کے عظیم خادم ہیں اور ان کے کام نے لاکھوں انسانوں کی زندگیاں اسلام کی اطاعت اور خدمت کے لئے وقف کیں۔ ان کا یہی کام ان کے لئے دنیا میں رفع ذکر اور آخرت میں بلندیٔ درجات کے لئے کافی ہے، میں ان کا ایک ادنیٰ فکری شاگرد ہوں۔"

سید اسعد گیلانی
۲ر اکتوبر ۱۹۷۹ء

مولانا گلزار احمد مظاہری

یہ تحریر مولانا گلزار احمد مظاہری کی ہے، موصوف علماء اکیڈمی منصورہ کے صدر ہیں، آپ کی "خطبات اسلام" جیسی کتاب ہے، یہ وہ خطبات ہیں جن کو موصوف نے انگلینڈ اور مسجد حرام میں دیا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مفکر اسلام، مبلغ جلیل، مجاہد عظیم حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی وفات حسرت آیات عالم اسلام میں ہی نہیں بلکہ عالم انسانیت کے لئے عظیم سانحہ ہے، تقریباً چالیس سال مجھے حضرت مولانا کے ساتھ رفاقت کا شرف رہا ہے، ان کی تعریفیں تو بہت ہیں لیکن چونکہ میں خود ایک طالب علم ہوں اور خدمت علم و علماء کا تھوڑا بہت موقع ملا ہے، اس پہلو سے جب میں دیکھتا ہوں تو حضرت مرحوم کو عظمتوں کی بلندیوں پر فائز المرام پاتا ہوں۔ ان کی زندگی کا عنوان ہی عبادت، عزیمت واستقامت ہے، علم، خدمت دین کے لئے انھوں نے حاصل کیا اور اسی دائرہ میں ساری عمر صرف کی۔ مناظرہ و مجادلہ سے سیکڑوں نہیں ہزاروں کوس دور تھے۔

سب سے زیادہ جس حلقے نے مولانا سے استفادہ کیا، وہ ہے مسلم نوجوانوں کا ہے، میری آرزو ہے کہ جس طرح نوجوان ان سے زندگی میں متعلق رہے، بعد وصال بھی متعلق رہیں۔

گلزار احمد مظاہری

مولانا سید حامد علی

اب مولانا سید حامد علی صاحب کے تاثرات نقل کر رہا ہوں، موصوف ہندوستانی جماعت اسلامی کے سکریٹری ہیں۔

۱ "مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جو پہلے مدظلہ تھے اور اب رحمۃ اللہ علیہ ہوچکے ہیں، اس دور میں سب سے بڑے محسن تھے، ان کی تحریروں سے میں الحاد کی سرحد سے پلٹ کر ایمان کے دائرے میں آیا، پھر انھیں کی تحریروں اور انھیں کی رہنمائی نے مجھے تحریک اسلامی کی راہ دکھائی، جس میں میں اپنی ہی نہیں سب انسانوں کی دنیوی کامرانی اور اخروی فلاح مضمر سمجھتا ہوں۔ پھر یہ انھیں کے افکار تھے جس کے نتیجے میں ایران میں اسلامی انقلاب رونما ہوا اور پاکستان میں نظام مصطفےٰ کا اعلان ہوا اور افغانستان میں اسلام اور کفر کا تصادم جاری ہے اور عالم اسلام بلکہ دنیائے انسانیت میں تحریک اسلامی کو فروغ ہو رہا ہے اور اسلام کی دعوت عام ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو قبول فرمائے۔ آمین

حامد علی ــ ۶ اکتوبر ۱۹۷۹ء

مولانا عبدالعزیز صاحب امیر جماعت اسلامی آندھرا

امیر جماعت اسلامی حلقہ آندھرا پردیش مولانا عبدالعزیز صاحب کے سامنے میں نے اپنی ڈائری بڑھائی تو مولانا کے تاثرات یہ تھے :-

مفکر اسلام داعی انقلاب بانی تحریک اسلامی برصغیر ہند و پاک ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ ان کی جدائی نے عالم اسلام کو ایک دردناک المیہ سے دوچار کر دیا لیکن انھوں نے جس ابدی پیغام عمل کو ہمارے سامنے چھوڑا ہے وہ انشاء اللہ ہم سب کو متحرک کرے گا تا آنکہ اقامت دین کا فریضہ پورا ہو جائے۔

مولانا نے عالم اسلام کی متعدد اسلامی تنظیموں کو بھی اسلامی فکر سے نوازا ہے اور دیکھتے دیکھتے اس صدی میں اسلام کی اس پر دنیا سے اسلام میں انقلابات کا آغاز ہو گیا۔ بالخصوص نوجوان گروہ مولانا کے احسانات عظیم کو فراموش نہ کر سکا، اس لئے کہ مرحوم و مغفور نے انھیں دنیا کے عیش و عشرت اور وطن و قوم و رنگ و نسل کی تنگنائیوں سے نکال کر اسلام کی عظیم الشان دعوت انقلابات سے روشناس کر دیا، آج عالم اسلامی کا مسلم نوجوان بیدار ہو رہا ہے ؎

پھر محبت کی حرارت، پھر تمنا، پھر نمود
حفظ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیر حجاب

مولانا نے جس تحریک کو اٹھایا ہے، آج اس سے وابستہ علمبرداروں کا فریضہ ہے کہ اس کو حکمت و دانائی سے اور عزم و ہمت اور پورے ایثار و قربانی کے ساتھ کامیاب کرنے کی پوری جد و جہد کریں، اللہ پاک محترم مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس عطا فرمائے ان کے پس ماندگان اور ان کے رفقاء کو اسی مقصد جلیل کے لئے وقف کر دے جس کی خاطر مولانا نے بیشمار قربانیاں دیں۔

عبدالعزیز - ۲ر اکتوبر ۷۹ء

مدیر زندگی رامپور

مدیر زندگی رامپور کی بوڑھی آنکھوں کے سامنے میں نے اپنی درخواست رکھی تو انھوں نے یہ موتیاں میری قیمتی زندگی میں ٹانک دیں :-

"اِنَّ اللہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ"

مولانا عاصم نعمانی

مولانا مرحوم کے دیرینہ رفیق مولانا عاصم نعمانی سے جب میں گویا ہوا تو بلکتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور فرمایا :-

"مولانا مرحوم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ زندگی بھر اپنے مخالف کے بارے میں ایک لفظ نہ لکھا، بارہا اوچھی اور سطحی تنقیدیں سامنے آئیں، مگر ہمیشہ عجز و انکسار کے ساتھ اپنے ہی دامن کی چھینٹوں کو دیکھتے رہے، دوسروں کی تنقیدوں پر ذرا بھی برافروختہ نہ ہوئے۔"

حسین فاروق مودودی

مولانا کے صاحبزادے حسین فاروق مودودی نے بلکتے روتے کہا :-

"مرحوم ابا جان نے ہم پر اپنے نظریات کبھی نہیں ٹھونسے ہمیشہ حکمت و موعظت کے ساتھ ہماری تربیت کی، ہمیں کبھی نہیں مارا، کبھی برا بھلا نہ کہا، ہم آپ کے انتہائی ممنون ہیں، وہ ہمارے ابا جان بھی تھے، مرشد و رہنما بھی۔"

حسین فاروق مودودی

بقیہ مولانا مودودی اپنا تعارف خود کراتے ہیں ۔ صفحہ ۳۰ سے آگے

۱۹۱۶ء میں میں نے مولوی کا امتحان دیا اور ریاضی میں کمزور ہونے کی وجہ سے درجہ دوم میں کامیاب ہوا، اس زمانے میں والد مرحوم کی مشکلات بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں اور ان کی صحت بھی جواب دیتی جارہی تھی، تاہم وہ حیدرآباد چھوڑ کر حیدرآباد تشریف لائے اور مجھے دارالعلوم کی جماعت مولوی عالم میں شریک کرادیا، اس زمانہ میں مولانا حمید الدین صاحب دارالعلوم کے صدر تھے، والد مرحوم مجھے حیدرآباد میں چھوڑ کر بھوپال تشریف لے گئے اور میں یہاں پڑھتا رہا، مگر یہ تعلیم کا سلسلہ چھ مہینے سے زیادہ جاری نہ رہ سکا، ایک روز بھوپال سے دفعتاً اطلاع آئی کہ والد پر فالج کا سخت حملہ ہوا ہے، یہ اطلاع پاتے ہی میں نہایت بے سروسامانی کی حالت میں والدہ ماجدہ کو ساتھ لے کر حیدرآباد سے روانہ ہوا اور بھوپال جاکر والد مرحوم کی خدمت میں منہمک ہوگیا۔ رفتہ رفتہ ان کے صحتیاب ہونے کی تمام امیدیں منقطع ہوگئیں اور اب زندگی کے تلخ حقائق نے بزور اپنے آپ کو منوانا شروع کیا، ڈیڑھ دو سال کے تجربات نے یہ سبق سکھایا کہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے جدوجہد کے بغیر چارہ نہیں، فطرت نے تحریر و انشاء کا ملکہ ودیعت فرمایا تھا، عام مطالعے سے اس کو اور تحریک ہوئی، اسی زمانے میں جناب نیاز فتحپوری سے دوستانہ تعلقات ہوئے اور ان کی صحبت بھی وجہ تحریک تھی، اس کے علاوہ دفتری ملازمت کی طرف طبعاً کوئی میلان نہ تھا اور اس قسم کی زندگی اختیار کرنے کو دل نہ چاہتا تھا غرض ان تمام وجوہ سے یہی فیصلہ کیا کہ قلم ہی کو وسیلۂ معاش قرار دینا چاہئے۔

۱۹۱۸ء میں سب سے پہلے میرے بھائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نے اخبار نویسی میں قدم رکھا اور اخبار مدینہ (بجنور) کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، میں بھی ان کے ساتھ گیا اور ہم دونوں نے مل کر کام شروع کیا، لیکن ڈیڑھ دو مہینے سے زیادہ ہم وہاں نہ رہ سکے، وہاں سے ہم دہلی واپس ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں سیاسی تحریک کے زبردست طوفان کی ابتداء ہوچکی تھی، کچھ فطری آزادی خیالی، کچھ ذاتی مطالعے، کچھ خاندانی روایات اور کچھ ماحول کے اثرات کا نتیجہ تھا کہ میں ابتداء ہی سے فرنگیت اور فرنگی تسلط سے نفرت رکھتا تھا اور طبیعت ہر ایسی تحریک کو قبول کرنے پر آمادہ تھی جو ہندوستان کو اس تسلط سے آزاد کرنے کے لئے کی جائے، اس کے ساتھ مذہبی جذبات بھی شریک ہوگئے، بہرحال ان وجوہ سے ہم نے "انجمن اعانت نظر بندانِ اسلام" میں کام کرنا شروع کیا اور پھر ۱۹۱۹ء میں جب خلافت اور ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز ہوا تو اس میں بھی حصہ لیا، اسی زمانے میں میں نے گاندھی جی کی سیرت پر بھی ایک کتاب لکھی مگر وہ ابھی زیر طبع تھی کہ میرے ایک عزیز نے پولیس سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی اور اسے ضبط کرادیا۔

اس زمانے میں ہماری ملاقات ایک اور صاحب سے ہوئی جو صوبہ متوسط کے رہنے والے تھے اور "انجمن اعانت نظر بندان" کی روح رواں تھے، تاج الدین ان کا نام تھا انھوں نے جبل پور سے "تاج" نامی ایک ہفتہ وار نکالا اور اس کی اڈیٹری ہم دونوں کے سپرد کی، مگر وہ زمانہ اخبارات کے لئے بڑا سخت ناسازگار تھا، چند مہینے سے زیادہ تاج نہ چل سکا، اور ہم جبل پور سے بھوپال اور بھوپال سے دہلی واپس چلے گئے۔ اب اخبار نویسی کی ضروریات نے مجھے انگریزی

پڑھنے پر مجبور کیا، خوش قسمتی سے ایک شفیق استاد مولوی محمد فاضل صاحب مجھے مل گئے انھوں نے میری طبیعت کا اندازہ کر کے یہ سمجھ لیا کہ اگر اس شاگرد کو پابند اور رنگ سے پڑھائی گئی تو اس کا دل اکھڑ جائے گا، اسی لئے انہوں نے ابتداء ہی ایک ایسی کتاب سے کرائی جو ایک زمانے میں میٹرک کے نصاب میں شریک تھی یہ تعلیم چار پانچ مہینے سے زیادہ نہ رہی اور اس مدت میں بھی کبھی ایک گھنٹے سے زیادہ استاد کی توجہ مجھے حاصل نہ ہو سکی، لیکن اس مدت میں میں نے جو کچھ پڑھ لیا اس کے بعد میں استاذ سے بے نیاز ہو گیا، اس کے بعد میں نے خود انگریزی اخبارات رسائل اور کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور دو سال تک صرف اسی ایک کام میں منہمک رہا، اول اول میرے بہت کچھ نہ آتا تھا، مگر اس کے باوجود میں ہر قسم اور ہر موضوع کی سہل اور مشکل عبارتیں پڑھتا تھا اور لغت کی مدد سے ان کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا، یہاں تک کہ الفاظ اور ان کے معانی اور ان کے محل استعمال اور مختلف اسالیب بیان میرے ذہن نشین ہوتے چلے گئے اور میں نے اتنی استعداد بہم پہنچا لی کہ انگریزی زبان میں تاریخ، فلسفہ، سیاسیات، معاشیات، مذاہب اور عمرانیات کا مطالعہ کر سکا، اور کبھی مجھے علمی مضامین کے سمجھنے میں دقت نہیں آئی۔

اب تک میری اور میرے بھائی کی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ تھی، مگر ۱۹۲۰ء سے ہم دونوں کی راہیں الگ ہو گئیں، بھائی نے اخبار نویسی کو عملاً چھوڑ دیا اور میں بالکل اسی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں تاج الدین صاحب نے جبل پور سے پھر "تاج" نکالا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے، کچھ مدت تک یہ اخبار ہفتہ وار نکلتا رہا، پھر روزانہ ہو گیا اور میں تنہا اس کو چلاتا رہا، اس کے ساتھ ہی میں نے وہاں عملاً سیاسی کام بھی کیا، جبل پور میں خلافت کی تحریک کا آغاز اور وہاں کے مسلمانوں کو کانگریس کے ساتھ شریک کرنے والوں میں ایک میں بھی تھا، اس زمانے میں وہاں مسلمانوں کی طرف سے بولنے والا کوئی نہ تھا، اس لئے مجبوراً مجھے تقریریں بھی کرنی پڑیں، حالانکہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں، بہرحال اس دوسری مرتبہ جبل پور کے قیام نے مجھے دو بڑے فائدے پہنچائے، ایک یہ کہ مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی جو پہلے نہ تھی، میں پہلے ذمہ داری کے کاموں سے گھبراتا تھا اور جب کوئی ایسا کام درپیش ہوتا تھا تو میں جھجکتا ہوا اس کی طرف بڑھتا تھا لیکن جبل پور میں جب میں نے تنہا کسی دوسرے کی مدد کے بغیر صرف اپنی ذمہ داری پر اخبار نویسی اور پبلک کی خدمت کی، تب مجھے احساس ہوا کہ میرے اندر کچھ مخفی قوتیں ہیں جو ضرورت کے موقعہ پر خود ابھر آتی ہیں اور میری مدد کرتی ہیں، اس وقت سے پھر کبھی میں کسی ذمہ داری کو قبول کرنے میں نہیں جھجکا، دوسرا فائدہ مجھے یہ حاصل ہوا کہ میں اپنی زندگی میں کلیۃً خود مختار ہو گیا اور جبل پور میں مجھے خود اختیاری کو عملاً برتنے کا موقع مل گیا، اس سے پہلے میں ہمیشہ کسی نہ کسی عزیز کے ساتھ رہا تھا اور دوسروں پر بھروسہ کرنے کی کمزوری کسی نہ کسی حد تک میرے اندر موجود تھا جبل پور کی زندگی زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکی جبکہ مجھ سے میرے ایک مضمون پر حکومت نے گرفت کی اور چونکہ اخبار کے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے تاج الدین صاحب کا نام شائع ہوتا تھا، اس لئے ان پر مقدمہ چلا دیا گیا گو اس طرح میں حکومت کی گرفت سے بچ گیا، لیکن مجھے اس سے بچنے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی اور آئندہ کے لئے میں نے عہد کیا کہ دوسروں کی ذمہ داری پر اخبار نویسی نہ کروں گا بلکہ اپنی ہر جنبش قلم کی ذمہ داری خود اپنے سر لوں گا۔

سنہ ۱۹۲۰ء کے خاتمے پر میں دہلی واپس ہوا، ۱۹۲۱ء کا ابتدائی زمانہ تھا، جب میری ملاقات مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب، صدر و ناظم جمعیۃ علمائے ہند سے ہوئی اسی سال انہوں نے جمعیۃ علمائے ہند کی طرف سے اخبار "مسلم" نکالا اور مجھے اس کا ایڈیٹر مقرر کیا، یہ اخبار سنہ ۱۹۲۳ء تک جاری رہا اور آخر تک میں اس کا ایڈیٹر رہا۔

۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۱ء تک کا زمانہ میرے لئے سخت مصائب

خانہ بدوشی اور پراگندہ حالی کا زمانہ تھا، اس لئے گو مجھے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جانے کا افسوس تھا مگر میں اس نقصان کی تلافی کرنے پر قادر نہ تھا، سنہ ۱۹۲۱ء میں جب مجھ کو اطمینان کے ساتھ دہلی میں بیٹھنا نصیب ہوا تو پھر تکمیل تعلیم کی طرف توجہ کی اور اخبار نویسی سے جو کچھ وقت بچا اسے مختلف اساتذہ سے عربی ادب، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق اور فلسفے کی کتابیں پڑھنے میں صرف کیا اور ہر فن کے متعلق ضروری استعداد بہم پہنچا لی۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں "مسلم" بند ہو گیا اور میں نے حیدر آباد کے قصد سے دہلی چھوڑ دی لیکن راستے میں بھوپال نے دامن پکڑ لیا اور میں نے حیدر آباد کا ارادہ ملتوی کر دیا، بھوپال میں ڈیڑھ سال تک میں ہمہ تن مطالعہ میں مصروف رہا اور بجز ایک دو مضامین کے، تحریر کا کوئی کام نہ کیا، سنہ ۱۹۲۴ء کے آغاز میں پھر دہلی واپس گیا، وہاں مولانا محمد علی سے مراسم پیدا ہوئے، ان کا ارادہ تھا کہ مجھے "ہمدرد" میں اپنا مددگار بنائیں لیکن اسی زمانے میں احمد سعید صاحب نے جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے اخبار الجمعیۃ نکالنے کا ارادہ ظاہر کیا اور قدیم تعلقات پر مجھے "الجمعیۃ" کو ہمدرد پر ترجیح دینی پڑی، اس کے علاوہ ترجیح کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ میں فطرۃً خود مختاری کو پسند کرتا ہوں، اور کسی دوسرے شخص کے ماتحت کام نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ میرے نزدیک کتنا ہی محترم ہو، غرض سنہ ۱۹۲۵ء کی ابتداء سے "الجمعیۃ" کی ابتدا ہوئی، اور سنہ ۱۹۲۸ء کی انتہا تک میں اس اخبار کو تنہا اپنی ذمہ داری پر چلاتا رہا، اس زمانے میں اخبار نویسی کے ساتھ مختلف علوم کا مطالعہ بھی جاری رہا، عربی کی درسیات میں سے بعض انتہائی کتابیں جو رہ گئی تھیں ان کا درس بھی لیا اور دو کتابیں بھی لکھیں جو "الجہاد فی الاسلام" اور "دولت آصفیہ وحکومت برطانیہ" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں

اس زمانے میں میں نے جرمن زبان سیکھنے کی کوشش کی مگر جن صاحب سے میں نے پڑھنا شروع کیا تھا وہ ڈیڑھ مہینے سے زیادہ دہلی میں نہ رہے، اس لئے میں اپنے ارادے کی تکمیل میں ناکام رہا۔

اب وہ زمانہ آیا جب دس سال کے مسلسل تجربات نے مجھے ہندوستان اور خصوصاً اردو زبان کی اخبار نویسی سے بالکل بیزار کر دیا تھا اور میرے لیے یہ زندگی سوہانِ روح ہوتی جا رہی تھی آخر کار سنہ ۱۹۲۸ء کے خاتمے پر میں نے "الجمعیۃ" سے قطع تعلق کر لیا اور آئندہ کے لئے تصنیف و تالیف کے مشغلے کو اپنے لئے پسند کیا، لیکن جن مضامین سے مجھ کو دلچسپی ہے ان پر تحقیقات کے لئے دہلی میں مواد بہم پہنچانا مشکل تھا، اس لئے پھر اسی سرزمین کی طرف مجھے رخ کرنا پڑا، جہاں سے بارہ برس قبل میں یہ سمجھ کر نکلا تھا کہ اب شاید کبھی یہاں آنا نصیب نہ ہوگا دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء میں میں حیدر آباد پہنچا اور اگست سنہ ۱۹۳۰ء تک یہاں رہا۔ اس مدت میں میں نے تاریخ آل سلجوق تالیف کی اور ابن خلکان کے ان حصوں کا ترجمہ کیا جو مصر کے فاطمی خلفاء سے تعلق رکھتے ہیں، اگست سنہ ۱۹۳۰ء میں بیمار ہو کر میں دہلی واپس چلا گیا، چند مہینے وہاں رہ کر صحت درست کی، پھر چند مہینے بھوپال میں رہ کر ایک مفصل تاریخ دکن کا مواد فراہم کرتا رہا، جسے لکھنے کا ایک عرصہ سے میں ارادہ کر رہا تھا جولائی سنہ ۱۹۳۱ء میں پھر حیدر آباد واپس آیا اور تاریخ دکن کا مواد فراہم کرنے میں منہمک ہو گیا، اس سلسلے میں میں نے نظام الملک آصف جاہ اول کی سیرت لکھی اور ایک مختصر تاریخ دکن لکھی جو شائع ہو چکی ہے۔

تحریر و انشاء کی طرف میرے فطری میلان کا اظہار سب سے پہلے اس وقت ہوا جب میں نو برس کا تھا، اس زمانے میں میرے ایک عزیز جناب اشفاق احمد صاحب زاہدی (صاحب فراست الیدم) جن کو مضمون نویسی اور کتب بینی کا شوق تھا، اورنگ آباد آئے اور کچھ مدت تک ہمارے ہاں رہے، انھوں نے ہم دونوں بھائیوں کے دلوں میں انشاء پردازی کا شوق پیدا کیا اور درسی کتابوں کے علاوہ عام مطالعے

اور اخبارات پڑھنے کی طرف بھی متوجہ کیا ۔ ایک مرتبہ انھوں نے ہماری صلاحیت کا امتحان لینے کے لئے کہا کہ اپنے خیال میں یہ سمجھ لو کہ تم کسی لڑکی پر عاشق ہو گئے ہو اور اپنے اس خیالی معشوق کو خط لکھو جس میں محبت کے جذبات اور ہجر کی تکالیف کا اظہار ہو ۔ یہ ایک ایسا مضمون تھا جس سے ہم بالکل نابلد تھے اور کم از کم میری عمر تو ایسی تھی کہ میرے ذہن میں عشق اور معشوق اور محبت اور ہجر کے تصور کی گنجائش ہی نہ تھی ، مگر اس زمانے میں گلستاں بوستاں پڑھ چکا تھا کہ عشق کوئی مرض ہے جو کسی اچھی صورت کو دیکھ کر ہو جایا کرتا ہے اور اس مرض سے دل کے اندر آگ لگ جایا کرتی ہے جو صرف اس کے ملنے سے ہی بجھتی ہے اور جب تک وہ نہ ملے اس وقت تک غریب بیمار جلتا رہتا ہے اور اس حالت کا نام ہجر ہے ۔ ان معلومات کو ہم نے اس وقت اپنی استعداد کے مطابق خوب استعمال کیا ، اور ایک ملا جلا خط ان کیفیات کے بیان میں لکھ کر پیش کر دیا ۔ اب ہم دونوں میں سے کسی کو یاد نہیں اور نہ بھائی اشفاق کو یاد ہے کہ ہم نے اس وقت کیا لکھا تھا ، مگر یہ ضرور ہے کہ وہ ان خطوط کو دیکھ کر پھڑک گئے تھے اور خصوصیت کے ساتھ میرے خط کو انھوں نے زیادہ پسند کیا تھا ، اگرچہ عبارت کے اعتبار سے بڑے بھائی کا خط زیادہ بڑھا ہوا تھا ۔

اس کے بعد گو مجھے ایک مدت تک لکھنے کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا ، کیونکہ والد مرحوم کی سخت نگرانی کی وجہ سے اپنا بیشتر وقت تعلیم میں صرف کرنا پڑتا تھا مگر تعلیم و تعلم سے جو کچھ وقت بچتا تھا ، اس میں اردو کی مختلف کتابیں بھی پڑھ لیا کرتا تھا جس سے مختلف کتابیں بھی پڑھ لیا کرتا تھا جس سے مختلف مضامین اور اسالیب بیان ذہن نشین ہوتے رہتے تھے ، ستمبر ۱۹۱۷ء میں مولوی کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد مجھے تھوڑی سی فرصت میسر آگئی اور والد مرحوم نے دماغ کو آرام دینے کی ہدایت فرمائی ۔ اس فرصت کے زمانے میں میں نے اپنے بھائی کی تحریک پر قاسم امین بے کی کتاب " المرأۃ الجدیدہ " کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا ، اب خدا جانے اس ترجمے کے اوراق کہاں ہیں مگر مجھے خوب یاد ہے کہ اس ترجمے کی روانی اور سلاست ، زبان اور محاورے دیکھ کر والد مرحوم بہت خوش ہوئے تھے اور بھائی نے بھی خوب داد دی تھی ۔

یہ میری ابتدائی مشق تھی ، اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں بھوپال میں قیام ہوا اور عام مطالعے کے ساتھ انشا پردازی کا شوق ایسا دامن گیر ہوا کہ اب شاید مرنے سے پہلے نہ چھوڑے گا ، ابتدائی تین چار سال تک تو مشق کی حالت تھی جس کا انداز تحریر پسند آتا تھا ، اسی کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا تھا ، مگر جوں جوں مطالعہ بڑھتا گیا ، میں یہ محسوس کرتا گیا کہ تحریر کی اصل خوبی دوسروں کے انداز میں لکھنا نہیں ہے ، بلکہ خود اپنے انداز میں لکھنا ہے ، ۱۹۲۱ء سے خود اپنا مستقل رنگ اختیار کیا ہے جس میں میں کسی کا مقلد نہیں ہوں ، میں اس نظریے کا قائل ہوں کہ ہر خیال اپنے ساتھ خود الفاظ لاتا ہے اور ہر خیال کو ادا کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں وہی الفاظ ہیں جو اس خیال کے ساتھ خود بخود چلے آتے ہیں ، لہٰذا ہمیں صرف مضمون سوچنا چاہئے ، باقی رہے الفاظ تو ان کے انتخاب میں الجھنے کی ضرورت نہیں ، وہ آپ سے آپ مضمون کے ساتھ آ جائیں گے ، یہی وجہ ہے کہ مجھے جب کبھی کچھ لکھنا ہوتا ہے تو اپنی تمام تر کوشش صرف خیالات کو مجتمع کرنے اور دلائل و شواہد اور مواد فراہم کرنے میں صرف کرتا ہوں اور جب دماغ میں مضمون مرتب ہو جاتا ہے تو پھر اسے کاغذ پر منتقل کرنے میں مجھے کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی ، الفاظ کے انتخاب میں میری بے اعتنائی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ اکثر و بیشتر میں لکھنے کے بعد نظر ثانی بھی نہیں کرتا ، الا اس صورت میں جب کہ کوئی خاص ذمہ داری کی تحریر لکھنی ہو ۔

ایک وقت تھا کہ عام مسلمانوں کی طرح میں خود بھی روایتی اور نسلی مذہبیت کا قائل اور اسی پر عمل پیرا تھا ، جب ہوش آیا تو محسوس ہوا کہ اس طرح محض " وجدنا علیہ آباءنا " کی پیروی ایک بے معنی چیز ہے ، آخر کار میں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف توجہ کی اسلام کو سمجھا اور جان بوجھ کر اس پر ایمان لایا ، پھر آہستہ آہستہ اسلام کے مجموعی اور تفصیلی نظام کو سمجھنے اور معلوم کرنے

کی کوشش کی، جب اللہ تعالیٰ نے قلب کو اس طرف سے پوری طرح مطمئن کر دیا تو جس حق پر خود ایمان لایا تھا اس کی طرف دوسروں کو دعوت دینے کا سلسلہ شروع کیا اور اس مقصد کے لئے سنہ ۱۳۵۲ھ میں ترجمان القرآن جاری کیا، ابتدائی چند سال الجھنوں کو صاف کرنے اور دین کا ایک واضح تصور پیش کرنے میں صرف ہوئے، اس کے بعد دین کو ایک تحریک کی شکل میں چلانے کے لئے پیشقدمی شروع کی اور دین کو تحریک کی شکل میں جاری کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری زندگی میں دینداری محض ایک انفرادی صورت میں جا بجا ساکن نہ رہ جائے، بلکہ اجتماعی صورت میں اس نظام دینی کو عملاً نافذ و قائم کرنے اور مانع و مزاحم قوتوں کو اس کے راستے سے ہٹانے کے لئے جدوجہد بھی کریں" ادارہ دار السلام" اس سلسلہ کا پہلا قدم تھا، ۱۳۵۷ھ (۱۹۳۸ء) میں یہ قدم اٹھایا گیا، اس وقت صرف چار آدمی رفیق کار تھے، اس چھوٹی سی ابتدا کو اس وقت بہت حقیر سمجھا گیا، مگر الحمد للہ ہم بددل نہ ہوئے اور اسلامی تحریک کی طرف دعوت دینے اور اس تحریک کے لئے نظری حیثیت سے ذہن ہموار کرنے کا کام لگاتار کرتے چلے گئے، اس دوران میں ایک ایک دو دو کر کے رفقاء کی تعداد بڑھتی رہی، ملک کے مختلف حصوں کے ہم خیال لوگوں کے چھوٹے چھوٹے حلقے بھی بنتے رہے اور لٹریچر کی اشاعت کے ساتھ ساتھ زبانی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ بھی چلتا رہا، آخر کار تحریک کے اثرات کا گہرا جائزہ لینے کے بعد محسوس ہوا کہ اب جماعت اسلامی کی تاسیس اور تحریک اسلامی کو منظم طور پر اٹھانے کیلئے زمین تیار ہو چکی ہے اور یہ وقت دوسرا قدم اٹھانے کے لئے موزوں ترین وقت ہے، چنانچہ اسی بنیاد پر ایک اجتماع منعقد کر کے تحریک کی بنیاد ڈال دی گئی۔

امارت جماعت

میں آپ کے درمیان نہ سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہوں نہ سب سے زیادہ متقی، نہ اور کسی خصوصیت میں مجھے فضیلت حاصل ہے بہر حال جب آپ نے مجھ پر اعتماد کر کے اس کار عظیم کا بار میرے اوپر رکھ دیا ہے تو میں اب اللہ سے دعا کرتا ہوں اور آپ لوگ بھی دعا کریں کہ مجھے اس بار کو سنبھالنے کی قوت عطا فرمائے اور آپ کے اس اعتماد کو مایوسی میں تبدیل نہ ہونے دے، میں اپنی حد وسع تک انتہائی کوشش کروں گا کہ اس کام کو پوری خدا ترسی اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ چلاؤں، میں قصداً اپنے فرض کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا، میں اپنے علم کی حد تک کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور خلفاء راشدین کے نقش قدم کی پیروی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا، تاہم اگر مجھ سے کوئی لغزش ہو اور آپ میں سے کوئی محسوس کرے کہ میں راہ راست سے ہٹ گیا ہوں تو مجھ پر یہ بدگمانی نہ کرے کہ میں راہ راست سے ہٹ گیا ہوں اور عمداً ایسا کر رہا ہوں، بلکہ حسن ظن سے کام لے اور نصیحت سے مجھے سیدھا کرنے کی کوشش کرے، آپ کا مجھ پر حق ہے کہ میں اپنے آرام و آسائش اور اپنے ذاتی فائدوں پر جماعت کے مفاد اور اس کے کام کی ذمہ داریوں کو ترجیح دوں، جماعت کے نظم کی حفاظت کروں، ارکان جماعت کے درمیان عدل اور دیانت کے ساتھ حکم کروں، جماعت کی طرف سے جو امانتیں میرے سپرد ہوں ان کی حفاظت کروں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے دل و دماغ اور جسم کی تمام طاقتوں کو اس مقصد میں صرف کر دوں جس کے لئے آپ کی جماعت اٹھی ہے اور میرا آپ پر یہ حق ہے کہ جب تک میں راہ راست پر چلوں آپ اس میں میرا ساتھ دیں، میرے حکم کی اطاعت کریں، نیک مشوروں سے اور امکانی امداد و اعانت سے میری تائید کریں اور جماعت کے نظم کو بگاڑنے والے طریقوں سے پرہیز کریں، مجھے اس تحریک کی عظمت اور خود اپنے نقائص کا پورا احساس ہے، میں جانتا ہوں کہ یہ وہ تحریک ہے جس کی قیادت پیغمبروں نے کی ہے اور زمانہ نبوت گذر جانے کے بعد وہ غیر معمولی انسان اس کو لے کر اٹھتے رہے ہیں جو نسل انسانی کے گل سر سبد تھے، مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے بارے میں یہ غلط فہمی نہیں ہوئی کہ میں اس عظیم الشان تحریک کی قیادت کا اہل ہوں، بلکہ میں تو اس کو بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ اس وقت

اس کارِ عظیم کے لئے آپ کو مجھ سے بہتر کوئی آدمی نہ ملا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے فرائض امارت کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ برابر تلاش میں رہوں گا کہ کوئی اہل تر آدمی اس کا بار اٹھانے کے لئے مل جائے اور جب میں ایسے آدمی کو پاؤں گا تو خود سب سے پہلے اس کے ہاتھ پر بیعت کروں گا نیز میں ہمیشہ اجتماعِ عام کے موقع پر جماعت سے بھی درخواست کرتا رہوں گا کہ اگر اب اس نے کوئی مجھ سے بہتر آدمی پا لیا ہے تو وہ اسے اپنا امیر منتخب کرے اور میں اس منصب سے بخوشی دست بردار ہو جاؤں گا، بہرحال میں انشاء اللہ اپنی ذات کو کبھی خدا کے راستے میں سدِ راہ نہ بننے دوں گا اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ دوں گا کہ ایک ناقص آدمی اس جماعت کی رہنمائی کر رہا ہے، اس لئے ہم اس میں داخل نہیں ہو سکتے، میں کہتا ہوں کہ کامل آئے اور یہ مقام جو آپ نے میرے سپرد کیا ہے ہر وقت اس کے لئے خالی کر سکتا ہوں، البتہ میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں کہ اگر کوئی دوسرا اس کام کو چلانے کے لئے نہ اٹھے تو میں بھی نہ اٹھوں، میرے لئے تو یہ تحریک عین مقصدِ زندگی ہے، میرا مرنا اور جینا اس کے لئے ہے، کوئی اس پر چلنے کے لئے تیار ہو یا نہ ہو، بہرحال مجھے تو اسی راہ پر چلنا ہے اور اسی راہ میں جان دینا ہے، کوئی آگے نہ بڑھے تو میں بڑھوں گا کوئی ساتھ نہ دے تو میں اکیلا چلوں گا، ساری دنیا متحد ہو کر مخالفت کرے گی تو مجھے تنِ تنہا اس سے لڑنے میں بھی باک نہیں ہے۔

میرا دینی فہم

میں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن وسنت ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، اس لئے میں کبھی یہ معلوم کرنے کے لئے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا ہے، یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ فلاں بزرگ کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے رہے ہیں، بلکہ صرف یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ قرآن کیا کہتا ہے اور رسول نے کیا کیا۔

فقہی مسلک

میرا مسلک یہ ہے کہ ایک صاحبِ علم آدمی کو براہِ راست کتاب وسنت سے حکم صحیح معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اس تحقیق وتجسس میں علماء سلف کی ماہرانہ آراء سے بھی مدد لینی چاہئے، نیز اختلافی مسائل میں اسے ہر تعصب سے پاک ہو کر کھلے دل سے تحقیق کرنی چاہئے کہ ائمہ مجتہدین میں سے کس کا اجتہاد کتاب وسنت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے، پھر جو چیز حق معلوم ہو اسی کی پیروی کرنی چاہئے۔

میرے نزدیک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ اگر یہ یاد رہے کہ اپنی تحقیق کی بنا پر کسی ایک اسکول کے طریقے اور اصول کا اتباع کرنا اور چیز ہے اور تقلید کی قسم کھا لینا بالکل دوسری چیز ہے اور یہی آخری چیز وہ ہے جسے میں صحیح نہیں سمجھتا۔

نظریۂ ادب

سماج کے لئے کوئی ادب پیدا کرنا میرے نزدیک غلط چیز ہے اس سے بہتر ہے کہ آدمی معاش کے لئے اینٹیں ڈھوئے۔ ادب دماغوں کو ڈھالنے والی چیز ہے، یہ کام محض معاش کیلئے نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کو تو بالکل اپنے نظریہ ومسلک پر کرنا ہوگا۔

ارباب صحافت کو اطلاع

میں نے اپنی عمر کا تقریباً دو تہائی حصہ مطالعہ وتحقیق اور غور وفکر میں صرف کیا ہے اس مدت میں پڑھ کر، سن کر، سوچ کر، سمجھ اور مشاہدہ وتجربہ کر کے میرے ذہن کا ایک خاص سانچہ بن چکا ہے، میری زندگی کا ایک نصب العین قرار پا چکا ہے، میری فکر کا ایک خاص انداز اور سوچنے کا ایک خاص طرز قائم ہو چکا ہے، میں کچھ رائیں رکھتا ہوں جن کی پشت پر برسوں کے مطالعہ سے فراہم کئے ہوئے دلائل ہیں، میں نے کچھ چیزوں کو حق پایا ہے

اور ان پر میں پورے قلبی و دماغی اطمینان کے ساتھ ایمان لایا ہوں اور کچھ چیزوں کو میں نے باطل پایا ہے اور ان کو قلب و دماغ کے متفقہ فیصلے کے ساتھ رد کر چکا ہوں، میرے ذہن اور ضمیر کے یہ فیصلے میری ذات کی حد تک بھی محدود نہیں رہے ہیں بلکہ میں ہمیشہ سے ان کی تبلیغ کر رہا ہوں، ہزاروں آدمیوں کو میں نے اس نصب العین کی طرف کھینچا ہے، جسے میں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنایا تھا، ہزاروں کا اس حق کا قائل کیا ہے جس حق کا میں خود قائل ہوا تھا۔ ہزاروں کا رشتہ اس باطل سے کٹوایا ہے جس سے میں نے خود اپنا رشتہ کاٹا تھا، ہزاروں بندگانِ خدا کی زندگیوں کو احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی اس جدوجہد میں مبتلا کر دیا ہے جس میں میں خود مبتلا ہوں۔ اب اگر کسی نے یہ سمجھا تھا کہ میرے ذہن اور خیالات اور مقصدِ زندگی ہر چیز کو محض طاقت کی دھونس اور جیل کی دلیل سے بدلا جا سکے گا تو میں اس کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کا صحیح مقام ایوانِ حکومت نہیں بلکہ شفاخانۂ امراضِ دماغی ہے اور اگر اس نے یہ توقع قائم کی تھی کہ اس دباؤ میں آ کر میں اپنا ضمیر اس کے ہاتھ رہن رکھ دوں گا اور آئندہ سے راستی ترک کئے ہوئے خیالات ظاہر کرنے لگوں گا تو میں اس کو مطلع کرتا ہوں کہ اس نے میری سیرت کو اپنی سیرت پر قیاس کرنے میں غلطی کی ہے، میرا دل صداقت کے لئے تو ہر وقت کھلا ہوا ہے اور میری رائے کو علمی اور عقلی دلائل سے بدلا جا سکتا ہے لیکن میرا ایمان و ضمیر کوئی قابلِ بیع و رہن چیز نہیں ہے، اس کی کوشش پہلے بھی جس نے کی ہے ناکام ہوا ہے اور آئندہ بھی جو کرے گا ان شاء اللہ منہ کی کھائے گا

(مطالبہ نظامِ اسلامی کی سزا بھگتنے کے لئے ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک ملتان جیل میں رہے۔

توکل

بلا مبالغہ آج شاید روئے زمین پر مجھ سے زیادہ مطمئن کوئی آدمی نہیں ہے۔ بال بچوں اور متعلقین کی مجھے فکر نہیں کیونکہ انھیں خدا کے حوالے کر آیا ہوں، قوم کی مجھے فکر نہیں کیونکہ اس معاملہ میں خدا کی طرف سے جتنی ذمہ داری مجھ پر تھی وہ سب موجودہ حکمران گروہ نے اپنے ذمے لی ہے۔ جماعتِ اسلامی اور دعوتِ اسلامی کی مجھے فکر نہیں کیونکہ گرفتار ہوتے ہی عند اللہ بری الذمہ ہو چکا ہوں، اور اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی سو فیصدی یقین رکھتا ہوں کہ اس کام کو میرے قید ہونے اور قید رہنے سے قطعاً کوئی نقصان نہ پہنچے گا، بلکہ اس کے برعکس فائدہ ہی پہنچے گا"

راہِ حق میں صبر

یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ سیکڑوں خدا کے بندے ایسے ہیں جنہوں نے اپنے نفس کی خاطر چوری، ڈاکہ، قتل اور دوسرے جرائم کئے ہیں اور ان کی پاداش میں کئی کئی سال قید کی اذیت برداشت کر رہے ہیں، انتہائی تکلیف کی زندگی گزار رہے ہیں، ان کے لئے نہ یہاں کوئی راحت ہے اور نہ حیاتِ اخروی ہی کے لئے ان کے پاس کوئی تسلی کا سامان ہے، سوال یہ ہے کہ اگر انسان یہ سب کچھ چند لمحوں کے عارضی فوائد اور لذتوں کی خاطر برداشت کر جاتا ہے تو کیا ہم کو یہ زیب دیتا ہے کہ جو کچھ ہم نے اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ خدا اور اس کے دین کے لئے کیا اور جس پر ہم ابدی زندگی میں اجر پانے کی توقع بھی رکھتے ہیں، اس کی پاداش میں بندوں کی کسی انتقامی کارروائی کو ہم ٹھنڈے دل سے برداشت نہ کریں اور اس ذرا سی اذیت پر جو ہمیں پہنچ رہی ہے مضطرب ہونے لگیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بندگانِ نفس کی بہ نسبت بندگانِ حق کو اگر دو گنے اور چوگنے مصائب و شدائد سے بھی سابقہ پیش آئے تو ان کی پیشانی پر بل نہ آنا چاہئے۔

ایک مستقل عارضہ

جس روز میں گرفتار ہوا تھا اس سے ۵-۶ روز پہلے مجھے محسوس ہوا کہ ایک پتھری گردے سے مثانے میں منتقل ہوئی ہے اپنا تجربہ میں نے تحلیل کر دینے کی دوا اور ترشی نمک سے کا استعمال

خود شروع کر دیا جس سے پتھری بالکل مثانہ میں آ کر اڑ گئی اور پیشاب رک رک کر آنے لگا جو اس بات کی علامت تھی کہ اب پتھری خارج ہوا چاہتی ہے، ٹھیک اسی زمانے میں وہ تاریخ آ گئی جو خدا نے میری گرفتاری کے لئے مقرر کی تھی اس حالت میں ظاہر ہے کہ نہ پیس کر پینے کی دوائیں استعمال ہو سکتی تھیں اور نہ جوشاندے کا اہتمام ہو سکتا تھا، اس لئے دوائیں چھوڑ چھاڑ کر پولیس کے ساتھ ہو لیا، لائل پور جیل میں تین چار روز پیشاب بے حد تکلیف سے آ رہا، بلکہ ایک دن تو بالکل ہی رک گیا تھا، اس وقت اگر دوا مل جاتی تو غالباً اسی وقت پتھری خارج ہو جاتی، مگر دوا نہ ملنے سے رفتہ رفتہ پتھری پیشاب کے راستے سے ہٹ گئی اور تکلیف جاتی رہی، اس وقت پتھریاں پھر اخراج کی طرف مائل ہیں مگر خدا کی مرضی کچھ اور معلوم ہوتی ہے اور غالب بہرحال اس کی مرضی کو ہونا ہے۔

عزیمت

بائٹ خود معائنہ کر کے علاج کے بارے میں رائے قائم کرنا مفید ہو سکتا ہے، لیکن معلوم ہوا کہ قواعد میں اس کی گنجائش نہیں ہے، اب صرف یہ صورت رہ جاتی ہے کہ میں بطورِ خاص حکومت سے یہ رعایت مانگوں کہ وہ مجھے اپنے معالج سے مشورہ لینے کی اجازت دے لیکن ظالم سے رعایت کا مطالبہ کرنا میرے اصولوں کے خلاف ہے، میں جان دے سکتا ہوں مگر رعایت کی درخواست نہیں دے سکتا۔

تنقید کا مسلک

میں نے اپنی پوری پبلک لائف میں گالیاں کھائیں تو بہت ہیں مگر الحمدللہ کہ کبھی گالی دی نہیں میں نے اصولاً جس کی رائے اور پالیسی کو صحیح سمجھا اس کی تائید کی ہے یا جس کی رائے یا پالیسی سے مجھے اتفاق نہیں رہا ہے اس پر بے خوف تنقید کی ہے مگر میں تحقیر سے ملوث ہوا ہوں اور نہ بدزبانی سے، شخصی طور سے میں نے ہمیشہ ان لوگوں کا احترام ملحوظ رکھا ہے جن سے قومی یا دینی معاملات میں اختلاف کیا ہے، میں صرف ایماندارانہ اور بامقصد تنقید کا قائل ہوں اور خدا اور رسول کے سوا کسی کو بھی تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتا خواہ وہ کوئی بھی ہو۔"

بچوں کی تربیت کا مقصد

"میں نے اس لئے بچوں کو ملاقات کے لئے جیل میں لانے سے منع کر رکھا تھا کہ بچوں کے ذہن پر یہاں کے ماحول کا برا اثر پڑنے کا اندیشہ تھا، مگر اب غور کرنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انھیں یہ جگہ ضرور دکھانی چاہیئے، کیا عجب کہ کل جو نسل اٹھنے والی ہے وہ موجودہ نسل سے بھی زیادہ بگڑی ہوئی ہو اور اس کے مقابلے میں ان لوگوں کو ہم سے بھی زیادہ سخت جدوجہد کرنی پڑے، میں اپنی اولاد کو عیش کے لئے نہیں پالنا چاہتا، بلکہ خیر کی خدمت اور شر سے جنگ کے لئے پالنا چاہتا ہوں۔"

"نہ میں کوئی رئیس آدمی ہوں اور نہ پیشہ ور لیڈر، میرے مکان پر کبھی دربان یا پاسبان نہیں رہے، ہر وقت ہر شخص سے آزادانہ ملتا رہا ہوں، البتہ یہ ضرور ہے کہ موجودہ زمانہ کی عام بگڑی ہوئی فضا میں کسی شخص کا بدگمانیوں سے بچنا مشکل ہے اور بدگمانی کرنے میں بندگانِ خدا حق بجانب بھی ہیں، ہو سکتا ہے کہ کوئی صاحب میرے پاس تشریف لائیں اور میں مکان پر موجود نہ ہوں، یا بیمار ہوں یا کسی عذر صحیح کی بنا پر باہر نہ آ سکتا ہوں اس صورت میں جو عذر کیا جائے اس پر یہ گمان کیا جائے کہ یہ عذر نہیں بہانہ ہے، لوگوں کو آئے دن ایسے تجربات ہوتے رہتے ہیں، اس لئے مجھے شکایت نہیں اگر وہ کسی کے صحیح عذر کو بھی نہ ملنے کا بہانہ سمجھیں۔

ارشد شامی

لوگ غصہ دلاتے مگر مولانا مودودی کو غصہ نہ آتا تھا

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا انتقال پُرملال ایک سانحہ ہی نہیں بلکہ ان کی وفات سے عالمِ اسلام ایک عظیم مفکر، مبلغ اور قائد سے محروم ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

آج جب کہ وہ ہم میں نہیں ہیں مجھے ان کی بہت سی باتیں یاد آرہی ہیں۔ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا تھا ان سے باتیں کی تھیں۔ مذہب، سیاست، فلسفہ، سائنس، تاریخ جیسے بہت سے موضوعات پر اور اس گفتگو کے دوران ان سے سوالات بھی کئے تھے مولانا نے جن کے بہت ہی پُرمغز جوابات دیئے تھے۔

یہ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں میں خبر رساں ایجنسی اے۔ پی۔ پی کا چیف پولیٹیکل کارسپانڈنٹ تھا اور تمام سیاسی جلسے اور مقررین اور نامور شخصیتوں کی پریس کانفرنسوں کو کور کیا کرتا تھا۔ اپنی صحافتی ذمہ داریوں کے سلسلے میں میں نے مولانا کی بہت سی پریس کانفرنسوں اور جلسوں کی رپورٹنگ بھی کی تھی جس میں مولانا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہم صحافی اپنی صحافیوں کے ساتھ مولانا سے ملتے، مولانا بہت ہی سنجیدگی سے بات کرتے اور بلا جھجک واقعہ ہوا ہے تھے۔ وہ صحافیوں کے سوالات کے جوابات نہایت متانت اور سنجیدگی سے دیا کرتے تھے ان کی حلیم الطبع طبیعت کبھی انہیں غصہ میں آنے نہیں دیتی تھی۔ اور وہ پیچیدہ سے پیچیدہ سوال کا جواب بھی بڑے تحمل سے دیتے۔ اور وہ قرآن کی زبان بھی لوگوں کو مبہوت بنا دیتی۔

۱۹۶۳ء میں مولانا کراچی تشریف لائے اور شہید ملت روڈ پر ایک مکان میں پریس کانفرنس بلائی جس کا دعوت نامہ جماعت اسلامی کی جانب سے جاری کیا گیا تھا اس زمانے میں کراچی میں جماعت اسلامی کے روحِ رواں ایک اور صوفی منش بزرگ چوہدری غلام محمد ہوا کرتے تھے جو بہت ہی شفیق اور مہربان شخص تھے ان سے ملاقات رہتی تھی۔ بہرحال میں پریس کانفرنس کو کور کرنے چلا گیا تھا۔ اس کا اصل تھا کہ مولانا کی پریس کانفرنس میں جانا ایک اعزاز تھا۔

اس زمانے میں شہید ملت روڈ اس قدر گنجان آباد نہ تھی۔ بہر صورت حسبِ عادت میں اخبار نویس پریس کانفرنس میں پہنچے۔ تاخیر سے جماعت کے مقامی صدر چوہدری غلام محمد مرحوم کے استفسار پر ایک اخبار نویس نے تاخیر کی یہ وجہ بتائی کہ اس جگہ کو تلاش کرنے میں دیر ہو گئی۔ یہ سنتے ہی مولانا نے مسکراتے ہوئے لہجے میں کہا یہ بات قرین قیاس نہیں کیونکہ حکومت ان کے لیے اس سلسلے میں آسانیاں فراہم کر دیتی ہے اور جہاں بھی ہم ہوتے ہیں وہاں ایسے کا ناکے متعین کر دیتی ہے اور ان راستوں کو پہچاننا اس لئے مشکل نہیں ہوتا۔ وہ بار بار پیش ہو سکتے ہیں۔ اور بہت ہی اطمینان کے ساتھ اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں مولانا کی باتیں سن کر محفل قہقہوں سے لالہ زار ہو گئی۔

۱۹۶۷ء کے انتخابات سے کچھ قبل مشرقی پاکستان کے گورنر عبدالمنعم خان مرحوم نے ایک اخباری بیان جاری کیا جس میں پاکستان کے صدر ایوب خان کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ صدر ایوب کے دور حکومت سے خلفائے راشدین کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔

اس بیان کی اشاعت کے چند روز پہلے مولانا کراچی تشریف لائے اور شہید ملت روڈ پر ہی ایک اور مکان میں پریس کانفرنس کی میں نے جانے کے دوران مولانا کی توجہ عبدالمنعم خان کے اس بیان کی جانب مبذول کراتے ہوئے ان سے اس پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا۔ مولانا نے خشمگیں

مسکراتے ہوئے کہا معلوم ہوا کہ جناب منعم خان کو حلقۂ راشدین کے بارے میں کافی غلط فہمی ہے میں نے دیکھا اس وقت مولانا کی آنکھوں میں بلا کی شوخی تھی۔

مولانا خود بھی بڑی محبوب شخصیت کے حامل تھے اور لوگوں سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے کسی بھی سوال کا جواب نہایت تحمل مگر دل نشیں پیرایہ میں دیتے برہم ہونا تو جیسے انہیں آتا ہی نہ تھا۔ حالانکہ ہمارے اکثر ساتھی محض ان کو برہم کرنے کے لیئے سوال کرتے لیکن انکی تمام تر کوششوں کے باوجود مولانا کو غصہ نہیں آتا تھا بلکہ ایسے موقعوں پر ان کی بذلہ سنجی کچھ اور بڑھ جاتی۔

ایک مرتبہ شیخ مسعود صادق مرحوم سے جو مغربی پاکستان کے ایک وزیر اور مولانا کے سیاسی حریف تھے مولانا کے بارے میں بحث ہو گئی انہوں نے مولانا کو بہت خراج تحسین پیش کیا ایک انگریزی تحریر کے بارے میں بات چیت ہوئی تو میں نے کہا کہ مولانا کو انگریزی نہیں آتی تو کہنے لگے یہ بات غلط ہے مولانا کو مجھ سے بھی زیادہ انگریزی آتی ہے۔

ایک اور واقعہ جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گا یہ ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ایک عالم دین سے جو کراچی میں اقامت پذیر ہیں ایک مسئلے کے بارے میں مشورہ طلب کیا، میرا سوال یہ تھا کہ کیا قادیانیوں سے لین دین سلام دعا وغیرہ جائز ہے کیونکہ ہمیں بچپن سے ہی تربیت دی گئی تھی کہ ان کا پانی بھی نہیں پینا چاہیئے۔

موصوف نے فرمایا کہ ان سے نہ تو سلام دعا جائز ہے اور نہ ہی لین دین لیکن چند روز بعد میں نے اس عالم دین کو ایک دعوت میں جس کا اہتمام قادیانیوں کا اور مسلمان خود دونوں میں قادیانیوں کے ہوٹل سے کیا تھا دیکھا تو مجھے ان کے قول و فعل میں ایک واضح تضاد نظر آیا چند روز بعد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کراچی تشریف لائے میں نے اپنا سوال ان کے سامنے دہرایا۔

فرمایا کہ سلام دعا میں پہل نہ کرو اور اگر ناگزیر ہو جائے تو لین دین میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، جہاں تک ممکن ہو اس سے گریز اچھا ہے یہ وہ بات تھی جس نے مجھ پر گہرا اثر کیا کتنا منطقی اور سمجھ میں آنے والا مشورہ تھا میں مولانا کا بہت مداح تھا آج مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں ایک محسن اور ایک ایسے عالم دین سے محروم ہو گیا ہوں جس کی طرف میں کسی بھی مسئلے اور ضرورت کے وقت رجوع کر سکتا تھا۔

خدا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کا مشن مکمل ہو۔ آمین وہ اندھیروں میں چراغ جلانے کے قائل تھے رہیں اپنے آپ کو اس قابل تو نہیں پاتا کہ مولانا جیسے محترم عالم دین کو کچھ خراج تحسین پیش کر سکوں بہرحال میں ان کے حضور اپنے احساسات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

بقیہ نواب زادہ نصراللہ خاں کا انٹرویو صفحہ ۱۳۱

مجھے اس سے پہلے نہ دیتے تو فوراً معذرت کرتے کہ انہیں یاد نہیں رہا تھا۔ اُن کی یہ باتیں دراصل ان کی شخصیت میں اخلاق اور مروت کے کوٹ کوٹ کر بھرا ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں

مولانا مودودی بے حد باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ سن لیجئے۔ پاکستان بننے کے کچھ ہی عرصہ بعد میں شورش کاشمیری اور مولانا مودودی ایک محلے سے گزر رہے تھے کہ راستہ میں مسجد آگئی۔ مسجد کے پاس ہی ایک صاحب کا گھر تھا جن کا احساس کرتے ہی جناب شورش کاشمیری نے کہا کہ مسجد کے [illegible] ذات چاہیئے جس پر مولانا مودودی نے کہا کہ بھئی! یوں کیوں نہیں کہتے کہ

"ایک بندۂ کیفر [illegible] یہ خدا ہے"

بہرکیف مولانا مودودی بہت بڑی شخصیت تھے جن کی وفات کے بعد بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے [illegible]

جنید احمد بلوچ گنج

حیاتِ مودودیؒ قدم بقدم

۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء ولادت ضلع اورنگ آباد (حیدرآباد دکن)

۱۹۱۴ء میں گیارہ سال کی عمر میں مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد سے مولوی کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۱۸ء میں اخبار مدینہ بجنور میں کام کیا، چند ماہ بعد وہاں سے اخبار بحیثیت ایڈیٹر نکالا۔

۱۹۱۸-۱۹ء میں مولوی محمد فاضل سے مکمل انگریزی تعلیم حاصل کی۔

۱۹۲۰ء میں سترہ سال کی عمر مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب جمعیۃ العلماء ہند کی طرف سے اخبار مسلم بحیثیت ایڈیٹر نکالا۔ ۱۹۲۳ء تک مسلم کے ایڈیٹر رہے۔ اور اسی دوران دہلی کے مختلف اساتذہ (بمشورہ مفتی کفایت اللہ صاحب) عربی ادب، تفسیر، حدیث، منطق اور فلسفہ کی کتابیں پڑھیں، حدیث کی تعلیم مولانا اشفاق اللہ صاحب کاندھلوی (بلند پایہ محدث) سے حاصل کی۔

۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۷ء تک تنہا الجمعیۃ کے ایڈیٹر رہے۔

۱۹۱۹ء تحریک خلافت میں سرگرم اور مجلس اعانت نظر بندان اسلام کے روح رواں تھے۔

۱۹۲۰ء والد صاحب کا انتقال۔

۱۹۲۶ء ۲۴ سال کی عمر میں اسلام کے قانون صلح و جنگ پر معرکۃ الآراء کتاب "الجہاد فی الاسلام" کی تصنیف کی۔

۱۹۲۸ء حیدرآباد دکن، تصنیف و تالیف میں مشغولیت (رسالہ دینیات) کی اشاعت۔

۱۹۳۲ء حیدرآباد سے ماہنامہ ترجمان القرآن کا اجراء۔

۱۹۳۳ء اسلامی تہذیب کے بنیادی اصول کی تصنیف

۱۹۳۲ء سے دعوت اسلامی کو عام کرنے کی تنہا انفرادی تک مسلسل کوشش ماہنامہ ترجمان اور کتابوں رسالوں کے ذریعہ کی۔

۱۹۳۶ء علامہ اقبالؒ سے مراسلات کا آغاز، مسلم یونیورسٹی کے استفسار پر جامع تعلیمی خاکہ کی تدوین۔

۱۹۳۷ء میں علامہ اقبالؒ سے لاہور میں ملاقات، علامہ کی طرف سے مولانا کو پنجاب منتقلی کا مشورہ، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش کے مضامین کی اشاعت۔

۱۹۳۸ء میں حیدرآباد سے پنجاب منتقل، دارالسلام پٹھان کوٹ کی تشکیل چار آدمی رفیق کار بنے، اور ادارہ دارالاسلام کا قیام اور مسئلہ قومیت کے عنوان سے مقالہ کی اشاعت، اسی سال ستمبر میں لاہور منتقل تجدید و احیائے دین، اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر اور دیگر بنیادی کتب منظر عام پر آئیں۔

۱۹۴۰ء معرکۃ الآراء کتاب "پردہ" منظر عام پر آئی۔

۱۹۴۰ء اسلامی نظام حکومت کا خاکہ تیار کرنے کیلئے مسلم لیگ کی کمیٹی میں رکن نامزد۔

۱۹۴۱ء میں جماعت کی تاسیس، کل ۷۵ آدمی رفیق کار بنے۔

۱۹۴۲ء میں تفہیم القرآن کا آغاز ترجمان القرآن کے ذریعہ

عوام کے سامنے پیش کیا۔
۱۹۴۶ء میں مشرقی یوپی و بہار کا مشترک اجتماع دربھنگا میں ہوا جس میں مولانا محترم نے شرکت کی۔
۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک مطالبہ نظام اسلامی کی سزا بھگتنے کے لئے ملتان جیل میں رہے۔
۱۹۴۷ء میں مہاجرین کی بحالی کے اقدامات میں مصروف۔
۱۹۴۹ء جماعت اسلامی کی مہم سے مجبور ہو کر حکومت پاکستان نے قرارداد مقاصد منظور کی۔
۱۹۵۰ء پاکستانی حکومت کے غیر اسلامی دستوری سفارشات پر زبردست تنقید۔
۱۹۵۱ء کراچی میں مختلف مکاتب فکر کے ۳۱ علماء کا تاریخی اجلاس نظام اسلامی کے نفاذ کے سلسلہ میں ۲۲ نکاتی دستاویز کی بالاتفاق منظوری۔
۱۹۵۲ء دستور ساز اسمبلی کے لئے ۸ نکاتی مطالبہ۔ اسلامی دستور کے لئے ملک گیر مہم۔
۱۹۵۳ء دوبارہ گرفتاری اور فوجی عدالت سے سزائے موت جو بعد میں عمر قید میں تبدیل ہوگئی
۱۹۵۵ء میں عدالت کے حکم پر رہائی۔
۱۹۵۵ء مولانا مودودی کی دستوری تقاریر و مضامین کا مجموعہ نحو الدستور الاسلامی، مصر میں شائع ہوا
۱۹۵۶ء اسلامی دستور کے حق میں مطالبہ کی مہم مشرقی پاکستان و مغربی پاکستان کا دورہ۔
۱۹۵۷ء میں مولانا مودودی کے دستوری مضامین کے عربی مجموعے اور ایک دستوری خاکہ مولانا کی اجازت سے شام میں شائع ہوا۔
۱۹۵۹ء تفہیم القرآن کے سلسلہ میں ارض القرآن کا طویل دورہ، عالم اسلام کے اتحاد کی کوشش۔
۱۹۶۲ء مکہ معظمہ میں عالم اسلامی کانفرنس میں شرکت رابطہ عالم الاسلامی کی تشکیل، مجلس تاسیس کے رکن

۱۹۶۳ء میں جماعت کے کل پاکستان کے اجتماع کے موقع پر مولانا پر قاتلانہ حملہ، ایک کارکن شہید، مولانا، مجلس شوریٰ کے ارکان کی گرفتاری، جماعت کے دفتر پر حکومت کا قبضہ، جماعت کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔
۱۹۶۴ء میں سپریم کورٹ میں جماعت کی بحالی اور تمام گرفتار شدگان کی رہائی کا حکم۔
۱۹۶۵ء میں ریڈیو پر تقریر کرنے کے لئے حکومت نے سفارش کی، اسے مولانا نے منظور کیا اور فرمایا کہ جارح کا منہ توڑ جواب دینا اسلامی ملت کا اہم فریضہ اور جہاد ہے۔
۱۹۶۷ء میں جمہوریت کی بحالی کے لئے دوسری جماعتوں کے اتحاد اور مولانا کی گرفتاری۔
۱۹۶۸ء لندن کا سفر، مسلمانان برطانیہ کی طرف سے ملتی ہوٹل میں یادگار استقبالیہ۔
۱۹۶۹ء اسلام کے آئینی مطالبات منوانے کیلئے سیاسی رہنماؤں کی گول میز کانفرنس میں شرکت، مرکزی عربی اسلامی یونیورسٹی کی تاسیس کانفرنس میں شرکت۔
۱۹۷۰ء میں انتخابات، ڈھاکہ میں مولانا کے جلسے پر تشدد کا حملہ، علاقائی پارٹیوں کو انتخاب میں کامیاب کرنے پر پاکستان کو سخت نقصان پہنچنے کے بارے میں مولانا کا انتباہ۔
۱۹۷۲ء خرابی صحت کی بناء پر جماعت اسلامی پاکستان کی امارت سے سبکدوشی۔
۱۹۷۴ء میں علاج کے لئے احمد فاروق مودودی کے کہنے پر امریکہ کا سفر، اسی سال دل کے دورہ عارضہ کا پہلا حملہ۔
۱۹۷۸ء پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کیلئے اقدامات۔
۱۹۷۹ء شاہ فیصل ایوارڈ کے لئے منتخب، عالم اسلام میں پچاس سالہ خدمات کا شایان شان اعتراف۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کی شب امریکہ میں بفلو کے مقام پر رحلت فرما گئے۔ انا للہ و ا ر
۲۶ ستمبر ۱۹۷۹ء کو لاہور میں سپرد خاک۔

دیا ہے جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

جامعۃ الفلاح بلریاگنج میں نماز جنازہ غائبانہ!

۲۲/ستمبر کی صبح کو جب ریڈیو پاکستان سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی خبر نشر ہوئی تو جامعۃ الفلاح کے اساتذہ وطلبا و تمام وابستگان پر جیسے ایک بجلی سی گر پڑی۔ ہر دل غمزدہ تھا۔ اور ہر آنکھ اشک بار تھی۔ جامعہ میں اس دن تعلیم بند کر دی گئی اور جلسۂ تعزیت منعقد ہوا جس میں تمام طلبا، اساتذہ اور دیگر حضرات شریک ہوئے۔ تلاوتِ قرآن کے بعد صدر جامعہ مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی کی تقریر سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ مولانا نے اپنی تقریر میں اس سانحہ پر اظہار رنج و غم کرتے ہوئے مولانا سے اپنے ابتدائی تعارف اور تعلق خاطر کا تذکرہ کیا اور مولانا کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ صدر جلسہ کی افتتاحی تقریر کے بعد استاد جامعہ جناب ماسٹر عبدالحلیم صاحب ایم اے علیگ نے دوران تقریر فرمایا کہ دل کا حال تو عجیب ہے دل تو یہ چاہتا ہے کہ مولانا ہم میں تا دیر بلکہ ہمیشہ باقی رہتے لیکن دل کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہر نفس کے لئے موت مقدر ہے جس سے کسی فرد بشر کو مفر نہیں۔ بہر حال مولانا دینی و ملی خدمات کے نتیجہ میں ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔ اور انہوں نے مغربی افکار و تہذیب کی مرعوبیت کے خاتمے اور اسلام سے عقیدت اور محبت کا جو نقش عام انسانوں اور بالخصوص نوجوانوں کے دلوں پر بٹھایا ہے وہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ اس کے بعد مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب استاذ جامعہ نے مولانا کی وفات کو دین و ملت کا ایک عظیم سانحہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ مولانا نے بلا شبہ مغربی افکار و تہذیب کی تردید میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور لوگوں کے دلوں سے باطل نظریات سے وابستگی کو نکال کر حق کی محبت بٹھائی ہے۔ لیکن ان منفی خدمات کے پہلو بہ پہلو مولانا نے مثبت انداز میں مولانا نے دین کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کے اعتراف میں بعض حلقوں میں بخل سے کام لیا جاتا ہے اور جس کا اظہار بعض اکابر کی زبان سے وقتاً فوقتاً ہوتا بھی رہتا ہے حالانکہ مولانا کا علمی تبحر قرآن و حدیث پر گہری نظر اور ان کی تعلیمات کی دل نشیں تشریحات پر مشتمل کتابیں اس پر شاہد ہیں۔ بعد میں یہ بھی فرمایا کہ مولانا کی شخصیت کسی خاص خطہ اور جماعت کے لئے مخصوص نہ تھی بلکہ سارا عالم اسلام موصوف سے فیضیاب اور ان کا عقیدت کیش تھا۔ چنانچہ ماضی میں جب ایک بار پاکستان میں موصوف کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی تو سارا عالم اسلام اس پر مضطرب و بے چین ہو گیا تھا اور عالمی احتجاج کے نتیجہ میں وہ سزا منسوخ کرنی پڑی تھی۔

اس کے بعد مولانا سلامت اللہ صاحب مدنی نے مولانا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ زندگی میں حادثات تو آئے دن پیش ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ حادثہ کچھ ایسا حادثہ ہے جس کا غم ہمیشہ تازہ رہے گا جسے آسانی سے بھلایا نہ جا سکے گا۔ نیز فرمایا کہ مولانا کی شخصیت مردم ساز، تاریخ ساز اور

عہد ساز شخصیت تھی۔ اس موقعہ پر موصوف نے مولانا مرحوم کا وہ پیغام بھی سنایا جو مولانا مرحوم نے عرب نوجوانوں کو بھیجا تھا جس میں آپ نے یہ فرمایا تھا کہ مجھے ایسے آثار نظر آ رہے ہیں کہ پندرھویں صدی کا آغاز بہت ہی مبارک آغاز ہوگا۔ اور ہر طرف اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے نوجوان کمربستہ ہو جائیں گے اور آپ نے نوجوانوں سے درخواست کی تھی کہ وہ اسلامی انقلاب کو برپا کرنے کے لئے اپنے کو وقف کر دیں۔

اس کے بعد عبید اللہ فہد متعلم درجہ تخصص نے بھی پرزور و پرجوش انداز میں مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا پھر جامعہ کے استاذ حدیث مولانا صغیر احسن صاحب اصلاحی نے مولانا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا کی شخصیت ایک بے مثال شخصیت تھی۔ مولانا کی ہمہ گیر تحریرات نے زندگی کے ہر موڑ پر ہماری رہنمائی فرمائی ہے حتیٰ کہ وقت وفات ایک جانے والے کے حق میں ہم کیا کریں اس سلسلے میں مولانا کی ایک تحریر آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جو میرے خیال سے اس موقعہ پر سب سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور جس سے ہمیں اس وقت ایک قیمتی رہنمائی ملتی ہے۔ اس کے بعد موصوف نے مولانا ممدوح کی تحریر "ایصال ثواب" کے عنوان سے پوری کی پوری حاضرین کو سنائی جو اس طرح کے مواقع کے لئے ایک بہت ہی جامع چیز ہے۔ اس کے بعد دعا پر جلسہ کا اختتام ہوا۔

دوسرے دن جمعیۃ الطلبہ جامعۃ الفلاح کی طرف سے بھی جلسۂ تعزیت منعقد ہوا جس میں بہت سے طلبہ نے اپنے گہرے جذبات رنج و غم کا اظہار کیا اور مولانا کو دلی خراج عقیدت پیش کیا۔

جامعہ کے مدرسۃ البنات میں بھی طالبات نے بھی اپنا جلسۂ تعزیت منعقد کیا۔ طالبات نے اپنے جذبات غم کا اظہار کرتے ہوئے مولانا کو بچشم نم خراج عقیدت پیش کیا۔ وہاں قرآن خوانی کا بھی نظم رہا۔

جامعہ میں مولانا کی غائبانہ نماز جنازہ کا اہتمام بھی کیا گیا جس میں جامعہ اور اطراف کے کثیر افراد نے شرکت کی۔

علاوہ ازیں جامعہ کے طلبہ قدیم کی انجمن نے اپنے ایک ہنگامی اجلاس میں اس سانحہ پر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔ اور مولانا کو بچشم نم خراج عقیدت پیش کیا۔ نیز یہ طے کیا ان کا ارگن ماہنامہ حیات نو کا اگلا شمارہ مولانا مودودی نمبر ہوگا۔ جو انشاء اللہ اواخر اکتوبر میں شائع ہو جائے گا۔

جامعہ جمعیۃ الطلبہ اور انجمن طلبہ قدیم کی طرف سے مولانا کے انتقال پر تعزیتی تار بھی ارسال کئے گئے۔ نیز جامعہ نے اپنے نمائندہ کی حیثیت سے عبد الحسیب اصلاحی صاحب کو اور انجمن طلبہ قدیم نے مولانا نور محمد فلاحی کو تعزیت کے لئے لاہور بھیجا ہے۔

جامعۃ الرشاد میں تعزیتی جلسہ

جامعۃ الرشاد کے ذمہ داروں کو ۲۳ ستمبر ۷۹ء کو یہ جانکاہ اطلاع ملی کہ عالم اسلام کے عظیم عالم دین اور تحریک جماعت اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔

مدرسہ کے طلبہ اور اساتذہ نے اس غم انگیز خبر کو ملال و افسوس کے غیر معمولی جذبات سے سنا اور مدرسہ میں فوراً ہی ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب" ناظم جامعۃ الرشاد" نے مولانا کی زندگی اور کارناموں پر بالتفصیل روشنی ڈالی۔ اور ان کے لئے مغفرت کی دعا کی گئی اور ایک تعزیتی تجویز پاس کر کے مولانا کے صاحبزادے کو بھیج دی گئی اور اسکی نقلیں اخبارات کو روانہ کی گئیں۔

جامعۃ الرشاد کے طلبہ و اساتذہ کا یہ جلسہ حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے انتقال پر اپنے دلی رنج و افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ اور ان کے لئے صمیم قلب سے

دعائے مغفرت کرتا ہے۔ مولانا کے انتقال سے عالم اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے موجودہ صدی میں حسن البنا مرحوم کے بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی دنیا کے ان کامیاب علماء میں ہیں جنہوں نے تنہا اپنی ذات سے اسلامی نظام کے قیام کی جو تحریک ہندوستان میں آج سے چالیس سال پہلے شروع کی تھی وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئی۔ ایک زمانہ میں یہ آواز عام لوگوں کے لئے نامانوس تھی۔ مگر آج ہر خاص و عام اس آواز سے مانوس ہو چکا ہے اور کئی اسلامی ملکوں میں ان کی تحریک کامیابی سے چل رہی ہے۔ اور عالم اسلام کا ایک بڑا حصہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے بے چین ہے۔ اور کہیں کہیں عملاً کام شروع بھی ہو چکا ہے۔ گو مولانا کی زندگی میں مکمل اسلامی نظام پاکستان یا کسی اور ملک میں نافذ نہیں ہو سکا مگر ان کی جدوجہد نے کئی ملکوں کو اس سے قریب تر ضرور کر دیا ہے اور امید ہے کہ دنیا جلد اسلامی نظام کی جلوہ فشانیاں آنکھوں سے دیکھ لے گی۔

مولانا نے اپنے پیچھے جو قیمتی لٹریچر، ایثار و قربانی اور استقامت و پامردی کی جو تاریخ اور ایک زندہ تحریک چھوڑی ہے وہ نہ صرف اس کو طویل مدت تک زندہ رکھے گی۔ بلکہ بہت سے سرد دلوں کو گرماتی رہے گی۔ ان کے لٹریچر سے ہزاروں بے دین اور ملحد نوجوانوں کی اصلاح ہوئی اور ان کی زندگیوں میں قابل رشک انقلاب آیا۔

ہم اللہ تعالےٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ان کی پر شور دینی حمیت اور اسلامی غیرت اور ان کے عظیم کارناموں کے صلہ میں ان سے جو غلطیاں ہوئی ہیں ان کو معاف کر دے اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اور نہ صرف ان کے مادی ورثہ کو بلکہ ان کے لاکھوں روحانی ورثوں کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کو ان کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

چاہے کوئی اس شعر کا مصداق ہو یا نہ ہو مگر مولانا اس شعر کے ضرور مصداق ہیں۔

فما کان قیس هلکه هلک واحد
ولکنه بنیان قوم تهدما

الصلوٰۃ علیٰ ترجمان القرآن

"الصلوٰۃ علیٰ ترجمان القرآن" وہ صدا ہے جو آج سے ساڑھے چھ سو برس پہلے مصر و شام سے لیکر چین کی دیواروں تک ابن تیمیہؒ کی نماز جنازہ کے لئے بلند ہوئی تھی جو وقت کے امام تھے۔ ضرورت ہے کہ آج یہ صدا پھر بلند ہو اور جامعہ کی اس میدانی زمین سے لے کر ہمالہ کے کوہستانی علاقوں تک، خانۂ کعبہ کی دیواروں سے لے کر اقوام متحدہ کے ایوانوں تک، غرض زمین کے ایک کنارے سے لیکر دوسرے کنارے تک پھیل جائے۔ اور زمین کے ایک ایک ذرے سے اس صدا کی بازگشت سنائی دینے لگے کیونکہ اس عہد کا ابن تیمیہ رخصت ہو گیا۔ سلام ہو اس پر، خدا کی رحمتیں ہوں اس پر۔

میرے محترم! آپ کو کیا معلوم وہ کون تھا وہ عہد حاضر کا معجزہ تھا، بہت بڑا معجزہ، علوم مشرق و مغرب کا خزانہ تھا وہ، زہد و ورع کی تصویر اور فضل و کمال کا مجسمہ تھا جہاں اس کے اندر تاروں کی سی خاموشی تھی وہیں سورج کی آب و تاب اور طوفان کی سطوت بھی۔ جہاں وہ علوم کا مجدد تھا وہیں عمل کا بھی مجاہد تھا۔ وقت کا امام اور زمانے کا بت شکن تھا، وہ ملت کا محسن تھا وہ وقت کا امام تھا۔ وہ اہل دنیا سے مستغنی تھا۔ وہ چاہتا تو دولت کا بادشاہ بن سکتا تھا۔ بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کی قیادت کر سکتا تھا۔ روس اور امریکہ جیسی سلطنتوں کو خوش کر سکتا تھا۔ اس کے بعد سے دنیا میں جو عزت کا مقام حاصل ہوتا وہ صدر کارٹر اور انور سادات سے کم نہ ہوتا۔ مگر اس کا مقصود خدا کو خوش کرنا تھا۔ اس نے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ساری دنیا سے مخالفت مول لے لی۔ سب سے برسر پیکار ہو گیا۔ سب کا دشمن بن گیا اور خدا کا دو…

ہو گیا۔ سبحان کتنا عظیم مرتبہ حاصل کر لیا۔ ہم گنہگار اس کے مغفرت کی دعائیں کیا مانگیں وہ تو خود عابد و زاہد تھا صبر و رضا کا پیکر تھا۔

خداوند! ہمیں توفیق دے کہ ہم بھی ان کے نقشِ قدم پر چلیں اور تیری مغفرت کے سزاوار و مستحق ٹھہریں۔ اور مرنے والے کی قبر کو نور سے بھر دے اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، اور شہداء و صدیقین کے ساتھ اسے اپنے خاص سائے میں جگہ دے کہ یہی اس کا مقصد تھا وہ اسی کا طالب تھا۔

محترم بزرگو اور عزیز ساتھیو! تیرہویں صدی کے اواخر اور چودہویں صدی کی ابتدا میں مغربیت زوروں پر تھی۔ انگریز ساری دنیا میں اپنی حکومت کا سکہ جمائے بیٹھے تھے مذہب کو پارہ پارہ کیا جا رہا تھا۔ مذہب کے ماننے والے لامذہبیت کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے تھے۔ مسلمان اپنے تحقیقی سرمائے سے محروم ہو چکے تھے اخلاقی لحاظ سے بھی ابتذال کا شکار تھے۔ لوٹ مار عریانیت عزتوں پر ڈاکہ ڈالنے کی بیماری اپنے شباب کو پہنچ گئی۔ ایسے شدید حالات میں مسلمانوں کا مغربیت سے متاثر ہونا بعید از امکان نہیں تھا۔ مسلمانوں کا وہ طبقہ جو انگریزوں اور انگریزوں کے لائے ہوئے افکار و نظریات سے مرعوب تھا بری طرح منافی اخلاقیات کا شکار ہو رہا تھا۔ جن کے اندر کچھ جوش تھا وہ بھی اسلام کی طرف سے مدافعانہ جنگ کر رہے تھے۔ جبکہ اسلام جارحانہ جنگ کے لیے آیا ہے۔ مسلمان اس قدر مرعوب ہوئے کہ انھوں نے مستغربین کے اس نعرے کی پرزور تائید کی "کہ اسلامی نظام فرسودہ ہو چکا ہے اب وہ انسانیت کی رہنمائی نہیں کر سکتا" اور ان مؤیدین میں صرف سطحی علماء ہی نہیں بلکہ دین کی گہری بصیرت رکھنے والے علماء بھی شامل تھے۔ خداء رحمٰن سے اسلام کی یہ کس مپرسی دیکھی نہ گئی اور دریائے رحمت جوش میں آیا اور انسانیت کی رہنمائی کے لئے اور اسلامی افکار کے ہیروں کو سنگریزوں سے الگ کر کے ایک ہار کی شکل میں پرونے کیلئے مولانا مودودیؒ کو علم خاص سے نواز کر اس سرزمین پر بھیجا۔

مولانا نے جب ذرا ہوش سنبھالا تو انھیں اسلامیات سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور اسلامیات کے تحقیقی مطالعے کیلئے عربی زبان کا سیکھنا بہت ضروری تھا اس لیے انہوں نے عربی تعلیم بھی حاصل کی اور اس میں اتنا عبور حاصل کر لیا کہ روز عربی کو بخوبی سمجھنے لگے اور عربی زبان کے فاضل یگانہ شمار ہونے لگے۔ اسلامیات کے مطالعے کے بعد مولانا نے جدید نظریات کا تنقیدی مطالعہ شروع کر دیا۔ زیادہ دن نہ گذرے کہ ان کی باریک بیں نظروں نے ان نظریات کی خرابیوں کو بھانپ لیا اور ان کی بنیادوں سے خوب واقف ہو گئے۔ ان علوم کا مطالعہ کرنا تھا کہ مولانا مرحوم کے اندر ہلچل پیدا ہو گئی۔ وہ تڑپنے لگے ان کا دل بے قرار ہو گیا، دن کا سکون اور رات کی نیند حرام ہو گئی جب لوگ رات کے آخری پہر میں خراٹے لے رہے ہوتے اور بادِ صبا کے پُرلطف جھونکوں سے محظوظ ہو رہے ہوتے وہ اپنے بستر پہ تڑپا کرتے۔ جب درد کی شدت حد سے تجاوز کرنے لگتی تو وہ اپنے مولا کے سامنے سربسجود ہو جاتے اس کے سامنے اپنی پریشانیوں کا سبب رکھتے۔ اسے گرم گرم آنسوؤں کے نذرانے پیش کرتے۔ اس طرح درد میں جب کچھ کمی آتی تو مؤذن کی اذان کانوں میں گونجتی اور وہ مسجد کی طرف روانہ ہو جاتے۔ درد و کرب، بے چینی و پریشانی کی یہ کیفیت ایک مدت تک جاری رہی۔ اس کے بعد انہوں نے قرآن پاک جو سارے علوم کا سرچشمہ ہے اس کا مطالعہ شروع کیا اس مطالعے کے دوران خدا نے مولانا کو خوب بصیرت عطا فرمائی۔ قرآن کے معارف و اسرار ایک ایک کر کے ان کے سامنے واضح ہوتے چلے گئے۔ مولانا قرآن کے فہم و تدبر پہ اپنا اچھا خاصا وقت صرف کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہونے لگا گویا مولانا ہر شے

سے بیگانہ اور ہر شغل سے ناآشنا ہو گئے ہیں۔ قرآن کے مطالعے سے ان کے اوپر علم کا دروازہ کھلا اسکی حقیقت مولانا اپنے الفاظ میں خود یوں فرما رہے ہیں۔

" جاہلیت کے زمانے میں میں نے بہت کچھ پڑھا ہے قدیم وجدید فلسفہ سائنس معاشیات سیاسیات پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اتار چکا ہوں مگر جب آنکھ کھول کر قرآن پڑھا تو یہ محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ تھا۔ علم کی جڑ اب ہاتھ آئی ہے۔ کانٹ، ہیگل، نٹشے، مارکس اور دنیا کے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں بیچاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں الجھتے رہے اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کیں اور پھر بھی حل نہ کر سکے۔ ان کو اس کتاب نے ایک ایک دو دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا ہے اگر یہ غریب اس کتاب سے ناواقف نہ ہوتے تو کیوں اپنی عمریں اس طرح ضائع کرتے میری اصل محسن یہی ایک کتاب ہے اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا۔ حیوان سے انسان بنا دیا۔ تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی۔ ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دیدیا کہ جس معاملے کی طرف نظر ڈالتا ہوں حقیقت اسطرح برملا مجھے دکھائی دیتی ہے۔ گویا کہ اس پر پردہ ہی نہیں ہے۔

انگریزی میں اس کنجی کو شاہ کلید (Master key) کہتے ہیں جس سے ہر قفل کھل جائے سو میرے لئے یہ قرآن شاہ کلید ہے مسائل حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں وہ کھل جاتا ہے۔ جس خدا نے یہ کتاب بخشی ہے اس کا شکر ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔"

یہ ہے مولانا کی وہ حقیقت بیانی جو قرآن کے مطالعے سے ان کے سامنے واضح ہوئی۔ جب مولانا کے اوپر قرآن کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی۔ جب ان کی نظروں نے قرآن کے علم وحکمت کے بے شمار خزانوں کو بھانپ لیا جب انھیں معلوم ہو گیا کہ قرآن ہی علوم ومعارف کا گنجینہ ہے جب وہ قرآن پاک کے اعجاز بیان اور بلاغت کلام سے واقف ہو گئے تو اب کیا تھا خوشی ومسرت کے ساتھ استعجاب کی ملی جلی لہر ان کے جسم میں دوڑ گئی اب انھیں معاشرے کی اصلاح کا تسلی بخش نسخہ دستیاب ہو گیا تھا وہ سارے جدید نظریات جو ان کے سامنے ایک سوالیہ نشان بن کر کھڑے ہو گئے تھے ان کو پارہ پارہ کرنے کا طریقہ معلوم ہو گیا تھا۔

اب انھیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ ایسے افراد کا ایک گروہ تیار کیا جائے جو اللہ ہی کو اپنا رب تسلیم کرتے ہوں اور رب ہونے کے حقوق بھی ادا کرتے ہوں ہوں۔ قرآن ہی کو اپنی زندگی کا دستور مانتے ہوں اور زندگی کے جملہ گوشوں میں قرآن ہی کے احکام کو نافذ کرتے ہوں۔ محمدؐ ہی کو اپنا رسول تسلیم کرتے ہوں انھیں کو اپنا پیرو و راہبر مانتے ہوں کیونکہ یہی سنت نبوی ہے فرمان باری تعالیٰ ہے " وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ " اور تم میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو بھلائی کی دعوت دے اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے اور یہی لوگ کامیاب ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ یہی سنت محمدی ہے آپ نے فرمایا جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی الگ ہوا اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال لیا۔ اور جو ایسی حالت میں مرا وہ کفر کی حالت میں مرا۔"

اس بنا پر دین کا کام صحیح طریقے سے انجام دینے کے لئے اور اس کا حق ادا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ایسے تمام لوگوں کو جو مذکورہ بالا اصولوں کو تسلیم کرتے ہوں اور انھیں اپنی زندگی میں نافذ کرنے کا عہد کرتے ہوں زندگی ایک

ایسی جماعت بنائی جائے جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔ جو تمام طاغوتی طاقتوں کا استیصال کرنے والی ہو۔ انسانوں کو انسانی حاکمیت سے نجات دلانے والی ہو اور صرف ایک اللہ کی حاکمیت کا پابند بنانے والی ہو۔ اسی خیال کے پیش نظر ۲۶ر اگست ۱۹۴۱ء کو انھوں نے چند ایسے افراد کو جو ان کے خیال سے موافقت رکھتے تھے جمع کیا اور ان کے سامنے اپنے دل کی دھڑکنوں کو الفاظ کی شکل میں رکھا تو لوگوں نے ان کی تائید کی اور اسی دن ایک ایسی جماعت کا وجود ہوا جس کا مقصد اقامت دین ہے جس کا حقیقی محرک رضائے الٰہی اور فلاحِ آخرت کا حصول ہے۔ جماعت کا یہ مقصد کوئی محدود مقصد نہیں ہے جس کا تعلق صرف ہند و پاک کے مسلمانوں سے ہو بلکہ وہ ایک عظیم انسانی نصب العین کی علمبردار ہے جس سے بلا امتیاز مذہب و ملت ہند و پاک کے تمام باشندوں اور دنیا کے تمام انسانوں کے مفادات وابستہ ہیں۔ جماعت کے انھیں اصولوں کو اپنے اپنے ملک کے سیاسی معاشی اور اخلاقی حالات کے لحاظ سے آج دنیا کی ساری اسلامی تحریکیں اپنائے ہوئے ہیں۔

میرے نزدیک مولانا کے کارناموں میں سب سے اہم یہی کارنامہ ہے۔ مولانا کے یہی وہ پیش کردہ اصول ہیں جنہوں نے آج زمین پر بسنے والے سارے صحیح الدماغ مسلمانوں کو ایک کر دیا ہے۔ عالمگیر اخوت کی ایک ایسی روح پھونک دی ہے کہ اگر آج ہندوستانی مسلمانوں کی چیخ نکلتی ہے تو اس کی تکلیف جاپان و امریکہ میں بسنے والے مسلمان محسوس کرتے ہیں ان کے درد کی وہ کیفیت ریڈیو و ٹیلی ویژن کے ذریعہ اخبار و رسائل کے ذریعے سے ہمیں معلوم ہوتی ہے۔ مولانا کے یہی وہ پیش کردہ نقوش ہیں جنھوں نے دور دراز بسنے والے علاقوں کے مسلمانوں کو ایک خاندان میں بدل دیا ہے۔ خواہ وہ افغانستان کا مجاہد ہو یا مصر کا اخوانی ہو، افریقہ کا کالا ہو یا امریکہ کا گورا ہو سب ایک دوسرے کی تکلیف کو اپنی تکلیف محسوس کرنے لگے ہیں۔ یہی وہ اخوت ہے جو مولانا کے پھانسی دیئے جانے کے وقت ظاہر ہوئی تھی۔ دنیا کے گوشے گوشے سے لاکھوں کی تعداد میں تار آئے جن میں لکھا تھا "اے حکومت پاکستان یہ تمہاری شخصیت نہیں یہ ہماری شخصیت ہے۔ یہ تمہاری ملکیت نہیں عالم اسلام کی ملکیت ہے۔ تجھے حق نہیں پہنچتا کہ عالم اسلام کو اس شفیق باپ سے محروم کر دے۔

میرے محترم بزرگو! گذشتہ سال جب مولانا خلیل حامدی صاحب پاکستان سے حج کے لئے تشریف لے گئے تھے تو انہوں نے وہاں سے کچھ مکتوبات بھیجے تھے، انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں مولانا محترم کے لئے عالم اسلام کے چیدہ چیدہ اشخاص کی بے قراری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا" یہاں جن حضرات سے بھی ملاقات ہو رہی ہے وہ سب سے پہلے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ العالی کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ مولانا کی بیماری سے سب لوگ شدید اداسی و پریشانی میں مبتلا ہیں۔ جو صاحب ملتے ہیں وہ تفصیل سے یہ پوچھتے ہیں کہ مولانا کی بیماری کی نوعیت کیا ہے؟ کیا وہ کوئی علمی کام کر رہے ہیں؟ کیا کچھ چل پھر سکتے ہیں؟ میں آپ سے کیا عرض کروں کہ دنیا کو مولانا محترم سے کس قدر دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ان کے دلوں میں بس گئے ہیں اور ان کی یہ محبت صرف اس خدمت اور جہاد کی بنا پر ہے جو مولانا نے احیائے اسلام کے سلسلے میں سرانجام دیا ہے۔ آپ مولانا تک یہ پیغام پہونچا دیں کہ بڑے بڑے اولیاء و صلحاء اور علماء و فقہاء، جو حج کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ اور جن سے ہماری ملاقاتیں ہو رہی ہیں، مولانا کو یہ مبارکباد دیتے ہیں کہ پاکستان کے اندر انکی آنکھوں کے سامنے اسلام کے غلبے کا آغاز ہو رہا ہے۔